آفتوں کے دور میں
ویریندر پٹواری

آفتوں کے دَور میں

ویریندر پٹواری

آفتوں کے دور میں

(افسانے)

ویریندر پٹواری

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

کتاب کا نام : آفتوں کے دور میں (افسانوں کا مجموعہ)

مصنّف کا نام : ویریندر پٹواری

سنِ اشاعت : 2011ء

تعداد : 400

قیمت : دوسو پچاس روپے

کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی

سرورق : انعم آرٹس، دہلی

مطبع : ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی-2

ISBN 978-81-8042-210-2

زیرِ اہتمام

پریم گوپال متل

موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

آہ اور واہ
دونوں کا تعلّق سوچ سے نہیں ہوسکتا
بلکہ سمجھ سے ہوتا ہے!
یعنی خیالات کے بجائے احساسات سے ہوتا ہے
دماغ سے نہیں، دِل سے ہوتا ہے!
واہ مسرّت کو آنسو میں بدل دیتی ہے
آہ رنج و غم کو گردابی طوفان میں بدل دیتی ہے!
یعنی آہ اور واہ
دونوں کا تعلّق
آنسوؤں سے ہوتا ہے!
فرق صرف اتنا کہ
خوشی کے آنسو نظر کو صاف کردیتے ہیں
غم کے آنسو نظر کو دُھندلا دیتے ہیں!

آہ!

میرے حصّے میں غم کے آنسو ہی آتے رہے

اُن آنسوؤں سے لکھے ہوئے میرے افسانوں کے مجموعے

'آفتوں کے دَور میں' کو

اپنے آنجہانی والدین پنڈت پریم ناتھ پٹواری، سوماوتی پٹواری

اپنی مرحومہ بیٹی سہاگ وتی آشا پٹواری سپرو

اور اپنی بیوی

مرحومہ للیتا پٹواری

کی یادیں تازہ کرنے کی خاطر

ان کو منسوب کررہا ہوں!!

——— ویریندر پٹواری

فہرست

مجھے کچھ کہنا ہے

ایک جھیل کے کنارے بیٹھے لوگوں کو چھوٹی بڑی، خوبصورت یا ڈراؤنی روپہلی یا آلودگی کی شکار آتی جاتی لہریں متوجہ تو کرتی ہیں مگر ایک صحافی کے ذہن میں خبر جنم لیتی ہے۔

اور وہ اپنے زاویوں سے دیکھ کر یا ان کی آوازیں سن کر خبر قارئین، سامعین یا ناظرین تک پہنچا دیتا ہے!

جبکہ یہی مناظر ایک سنگیت کار کو راگ راگنیاں چھیڑ کر گانے یا بجانے کے لیے اُکسا دیتے ہیں۔

اور وہ بندشیں باندھ کر سنگیت سے پیار کرنے والوں کو سناتا ہے۔

ایک مصوّر اپنے نقطۂ نظر سے ان مناظر کو کینوس پر اُتار کر رنگوں کی زبان سمجھنے والوں کو کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے!

ایک دانشور سوچتا رہتا ہے کہ لہروں کو کنارے اپنے پاس بلا کر ان کا وجود مٹا دیتے ہیں یا لہریں ہی کناروں سے ٹکرا کر اپنا سفر پورا کرتی رہتی ہیں۔ خواہشات اور خدشات کے گرداب میں پھنس کر وہ کناروں کے کٹ جانے کے بارے میں سوچتا رہتا ہے!

ایک کہانی کار لہروں کی چال ڈھال دیکھ کر، ان سے پوچھ تاچھ کر کے بلکہ جھیل میں ڈبکیاں لگا کر اپنے ہم خیال ہم سفروں کو جھیل، لہروں اور کناروں کی ایک دوسرے سے جڑی غم اور خوشی کی کہانی سناتا ہے!

قارئین، سامعین اور ناظرین عام انسان ہوتے ہیں، جن میں کچھ ذی ہوش ہوتے ہیں، کچھ ہر حال میں خود سے پیار کرنے والے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو نہ کسی کی سنتے ہیں اور نہ کسی کو کچھ سناتے ہیں۔

کچھ لوگ احمق ہوتے ہیں، کچھ بے وقوف جو کاروانِ زندگی میں شامل ہو کر، پاؤں زمین پر رکھے بغیر بھی ایسے چلتے رہتے ہیں گویا کسی کے ہاتھ میں جھنڈا!

ان سب پر نظر رکھنے والے چند لوگ جو خود کچھ کرتے نہیں اور کسی تخلیقی صلاحیت کا، چاہتے ہوئے بھی مظاہرہ نہیں کر پاتے ہیں اس لیے اپنے ہی اونچے میناروں پر کھڑے ہو کر تخلیق کاروں کو بلندی سے دیکھ کر ان کو اپنی حوصلہ شکن منصوبہ بندی سے بونوں کا رُتبہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی جو سنگیت کی عمیق گہرائیوں سے واقف نہیں ہے وہ گلوکار یا سازکار کو کاٹھ کے ٹکڑے سمجھ کر خود ساختہ نقاد بن جاتا ہے، اور سکون بخش کلاسیکل گائیکی کو ایک Organised Hysteria کا نام دے کر زہریلے طنز کرتا رہتا ہے۔

یعنی جعلی تخلیق کار معقول تخلیق کاروں پر حاوی ہو کر، کچھ کیے بغیر اعزازات اور انعامات لیتے ہیں۔

تخلیق کار کون ہے؟

ایک چتر کار، مورتی کار، قلم کار، گیت کار، ایک سنگیت کار اور فنونِ لطیفہ کی ہر اُمنگ کے ساتھ کام کرنے والا فلم کار تخلیق کار ہے۔

تخلیق کار ہی تحقیق کار اور تنقید نگار ہے۔

تخلیق کے سات رنگوں کو ایک ہی رنگ میں دیکھنے والا دانشور ہے۔

ہر تخلیق کار کو اس کی اپنی ہی تخلیق پہچان دلاتی ہے۔

اُردو ادب کی بات کریں تو گھس پیٹھیے بے ادب لوگ دردناک یا انقلابی تخلص کے بل بوتے پر بے شک اعزازات لے کر بھی تاریخ میں نظر نہیں آئیں گے۔

تخلیق کار جنم لیتے ہیں، بنائے نہیں جاتے۔

اپنے عقیدے کے مطابق بس اتنا کہوں گا کہ جن پر علم کی دیوی ماتا سرسوتی مہربان ہو وہی تخلیق کار ہوتے ہیں۔ اور تخلیقی ذہن میں تخلیقات ہی جنم لے سکتی ہیں۔ اچھی یا بری، سچی یا جھوٹی، ثمر آفریں یا تباہ کن۔ مگر یہ سچ ہے کہ قلم کار، اداکار، سنگیت کار، صداکار، چتر کار، فلم کار یا فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے ہی تخلیق کار ہوتے ہیں۔ ہاں کس کو کیا کرنا ہے یہ خدا کی رضا ہے۔

کسی کو عزت، شہرت یا دولت مل جاتی ہے یہ بھی رضائے خدا ہے!

میں خوش بخت ہوں کہ چند اُردو اکاڈمیوں نے مجھے انعامات سے نوازا ہے (میں ان کا مشکور ہوں)

عام طور پر مفکر سمجھتے ہیں کہ ایک تخلیق کار، چھوٹا یا بڑا، جانا مانا یا گمنام، اعزازات پانے والا یا نظر انداز ہو چکا، پھر بھی ایک فنکار رہتا ہے۔

اس بات کو ماننا ہی پڑتا ہے کہ ایک فنکار چار عدد جزو کا مرکّب ہوتا ہے:

پہلا جُز - وراثت یعنی Inheritance

دوسرا جُز - صحبت یعنی Company ۔ اچھی صحبت سے وراثت میں پائی گئی تخلیقی صلاحیتوں کو تقویت ملتی ہے۔

تیسرا جُز - تربیت یعنی Education، جو تخلیقی صلاحیتوں کی خامیوں اور خوبیوں کے بارے میں نہ صرف جانکاری دیتی ہے بلکہ مددگاری کے گُر بھی سمجھاتی ہے۔ جیسے کسی گایک کو سُر لَے کا گیان!

چوتھا جُز - تخلیق کار کا مشاہدہ، مطالعہ، تصوّر اور ریاض کے بعد ادائیگی۔

میں خوش قسمت ہوں کہ:

(۱) اپنے دادا آنجہانی گلاب رام پٹواری، ساکن سوپور، کشمیر

— اپنے نانا آنجہانی آفتاب رام پوتو، ساکن سوپور، کشمیر

— اپنے والد آنجہانی پریم ناتھ پٹواری مسؔرور کشمیری

— اپنی والدہ آنجہانی سوماوتی پٹواری — سے مجھے تخلیقی صلاحیتیں ورثے میں ملی ہیں۔

میرے والدِ مرحوم ایک زبان دان ہونے کے ساتھ ایک جانے مانے شاعر تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُردو، ہندی، فارسی اور انگریزی زبان پر عبور تھا۔ وہ مصوّر بھی تھے۔

جبکہ میری والدہ مرحومہ اسّی سال کی عمر میں سُر اور لَے میں پنچم سُر میں کشمیری نغمے گایا کرتی تھیں۔ وہ مٹّی کے بُت بھی بنایا کرتی تھیں۔

(۲) میرے والدِ مرحوم کے ذوق کی وجہ سے بچپن سے میرا ادب سے لگاؤ ایک شوق بن گیا تھا۔

(۳) میرے پھوپھی زاد بھائی شری برج لال دَر کو اُردو شاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ان کی وجہ سے مرحوم فیض احمد فیضؔ کا کلام تب میں نے سن کر یادداشت کا حصہ بنا لیا تھا جب میں مشکل سے چودہ سال کا تھا۔ان کی ایک بہت بڑی لائبریری تھی جو میرے لیے گنجینۂ ادب ثابت ہوکر میرے لیے تربیت کا کام کرگئی۔

میرے چھوٹے بھائیوں شری راجندر پٹواری (جو ایک مشہور مصوّر بھی ہیں، میرے لیے اُردو کے مشہور ادبا و شعرا کی کتابیں ممبئی سے لایا کرتے تھے) اور ڈاکٹر اشوک کی صحبت اور تبادلہ ٔخیال سے بھی مجھے اپنی ابتدائی کہانیوں کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں جانکاری ملتی رہی۔ممبئی میں پڑھائی کے دوران راجندر کی مرحوم علی سردار جعفری اور مرحوم ساحرلدھیانوی سے خاصی جان پہچان ہوگئی تھی اور میری پہلی کہانی کا انتخاب انھوں نے ہی کیا تھا۔

(۴) میں پیشے سے ایک سوِل انجینئر ہوں۔شاید ادب سے ناطہ ٹوٹ چکا ہوتا اگر مرحوم تاجدار صدیقی، جوتب 'شاعر' ممبئی کے مدیر تھے، میری ایک کہانی اپنے جریدے میں شائع کر کے مجھے نیشنل لیول پر نہ لایا ہوتا۔'شاعر' میں چند اور کہانیاں شائع ہوئیں تو 'بیسویں صدی' دہلی میں بھی ایک کہانی شائع ہوئی۔ پھر کہانیاں واپس آنے کی بجائے مدیران کے خطوط آتے رہے اور میں نے پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔

جناب مظہر امام نے، جوخود ایک قدآور شاعر ہیں، میری حوصلہ افزائی کی۔شری پران کشور اور شری وشنو بھاردواج نے سامعین اور ناظرین سے میرا تعارف کرادیا۔اس دوران ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے جریدے 'چنگاری' میں میری ایک کہانی شائع کر کے ایک بونے کو قدآور کہانی کاروں کے کارواں میں شامل کردیا۔

مرحوم پشکر ناتھ، مرحوم علی محمد لون، مرحومہ عصمت چغتائی اور مرحوم رام لال جیسے بلند ادب پروروں کی صحت مند تنقید نے میرے لیے ایک اچھی تربیت کا کام کیا۔دراصل شروعات میں اپنی خوبیوں کے بارے میں جانکاری پانے سے اچھا ہے کہ اپنی خامیوں کے بارے میں

احساس دلایا جائے، یہ میری تربیت تھی۔

تربیت کے بعد اُردو دُنیا نے مجھے اپنا لیا اور نیشنل اور انٹرنیشنل سطح کے جرائد میں میری اب تک تقریباً دو سو ساٹھ کہانیاں شائع ہو کر بلند ذوق قارئین نے پسند کی ہیں۔

جموں یونیورسٹی کی دو طالبات نے میرے افسانوں کے مجموعے 'بے چین لمحوں کا تنہا سفر' اور ڈراموں کے مجموعے 'انسان' پر ایم.فل کی سند حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ چند شہرت یافتہ تحقیق کاروں اور تنقید نگاروں نے اپنی انعامات واعزازات پانے والی کتابوں میں میری افسانہ نگاری پر لکھے اپنے مضامین شامل کر کے میرے قلم پر میری گرفت کو مضبوط کر دیا ہے ورنہ ایک کار حادثے کی وجہ سے میں جسمانی طور پر اپاہج ہوں۔ نہ چل پھر سکتا ہوں اور نہ بول سکتا ہوں — مگر سوچ سکتا ہوں، سمجھ سکتا ہوں، پڑھ سکتا ہوں، لکھ سکتا ہوں۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے۔ 'شاعر' اور 'رنگ' جریدوں نے میرے گوشے شائع کر دیے ہیں۔

اب تک میرے سات افسانوں کے مجموعے اور دو ڈراموں کے مجموعے اُردو میں شائع ہوئے ہیں۔ ایک ناولٹ دیوناگری لپی میں شائع ہو چکا ہے اور اپنی مادری زبان کشمیری میں افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ 'آفتوں کے دَور میں' میرا آٹھواں افسانوں کا مجموعہ ہے۔ دو عدد ناول زیر ترتیب ہیں۔

میں نے اپنی کہانیوں اور ڈراموں میں کئی تجربات کیے ہیں۔ کچھ تجربات قارئین، سامعین اور ناظرین کو پسند آئے اور کچھ مسترد کر دیے گئے۔ مثلاً ناولٹ 'کب بھور ہوئی' نثری نظم میں لکھا تھا۔ قارئین نے میری اس کاوش کو خارج کر دیا۔ دراصل میں نے یہ ناولٹ اُردو میں 'وہ صبح کبھی تو آئے گی'' کے عنوان سے لکھا تھا اور ریاستی کلچرل اکادمی سے مالی تعاون لے کر اُردو اور دیوناگری لپی میں ایک ساتھ شائع کرنے کا خواہشمند تھا۔ اکادمی نے ہندی میں چھاپنے کی منظوری دی اس لیے کتاب صرف ہندی میں ہی شائع ہو سکی۔ ہندی والوں نے ناولٹ کو اُردو کی کتاب سمجھ کر خارج کر دیا جبکہ اُردو والوں نے ناولٹ کو ہندی کتاب سمجھ کر قبول نہیں کیا۔

'آفتوں کے دور میں' میرے ۲۱ عدد قدرے طویل اور مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ میں نے سچی کہانیوں کو اپنے تصور کی مدد سے افسانوں کی شکل دے کر آج کل کے حالات

سے پیدا ہوئے واقعات یا واقعات سے بنائے گئے حالات کو تحریراً بیان کر کے عیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے مرحوم وین گاگ نے اپنی کشمکشِ زندگی کو، اپنے پھٹے جوتے کو کینواس پر اُتار کر عیاں کر کے بیان کی تھی۔ میں نے قدیم کشمیری کہانی گو کی طرح چند افسانوں میں جانوروں کو زبان دے کر کل، آج اور آنے والے کل کے بارے میں کچھ کہنا چاہا ہے یا اساطیری کتھاؤں یا زمانہ شجات کے کرداروں کے حوالوں سے بیتے ہوئے 'کل' کو 'آج' سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ میرے ایک تخلیق کار کو میری کہانی 'جانور' میں ریچھ کے سینے میں انسان کا دل۔ ایک بچکانہ سوچ لگ رہی ہے۔ اب میں اپنے قارئین کو کیسے سمجھاؤں کہ الیگوریز (Allegories) لکھنے کے لیے مہندر پنڈت نے پنچ تنتر (Panchtantra) کی کہانی لکھ کر دنیا کو چونکا دیا ہے۔

اپنے ۴۷ برس کے ادبی سفر کے دوران میں نے 'اچانک' یا 'آزمائش' جیسے افسانے لکھ کر قارئین کی داد حاصل کی ہے۔ پھر بھی بقول غالبؔ:

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دِل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور!

میں پچھلے دو سال سے مصر کی راجدھانی قاہرہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ رہ رہا تھا کہ مجھے دہلی لوٹ کر آنا پڑا کیونکہ میری مرحومہ بیوی کے دونوں گردوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ ۶ رمئی ۲۰۱۰ء کو وہ میرے آنجہانی والدین اور میری لختِ جگر بیٹی کے پاس چلی گئی!

گویا ایک تخلیق کار اُکھڑ کر اُجڑ گیا ہوتا اگر اس کا چھوٹا بھائی اشوک پٹواری، جو خود انگریزی اور اُردو زبانوں میں درجنوں بے مثال کہانیاں لکھ چکا ہے، اس کی لرز رہی گرفت سے نکل رہے قلم کو تھامنے کی کوشش نہ کرتا! خزاں کے بعد آئی بہار! میں اپنا یہ مجموعہ جو اُس کی ہی بدولت شائع ہو رہا ہے، اُس کے نام منسوب کر رہا ہوں!

—— ویریندر پٹواری

پھر ہوا ایسا کہ!

(برصغیر کے قدآور قلم کار جناب آغا گل کی کہانی 'گوریچ' سے متاثر ہو کر)

سر سبز پتوں کو معلوم نہیں ہے
کہ درخت کیوں تھرتھرا رہا ہے
شاخیں کیوں کانپ رہی ہیں
اور وہ کیوں گرتے جا رہے ہیں
حیران ہو کر
سرگوشیوں میں
پوچھ رہے تھے
ایک دوسرے سے
کیا تم نے لمبی لمبی گردن والے
سائبیریا کی برف سے
اُڑ کر آئے
پرندوں کو دیکھا تھا؟
پھر ان کے عقب میں آئے
تیزی سے دوڑتی ہوئی
ہواؤں کو محسوس کیا تھا؟

گوریچ کی ہوائیں ہوتیں
تو ہمارے رنگ زرد ہوتے!
اور ہم ایک دوسرے سے
بچھڑ کر اُڑتے اُڑتے
جانے کہاں پہنچ گئے ہوتے!
درخت کے نیچے بیٹھی
زندہ بیوہ
اپنے کاجل کو
آنسوؤں سے دھو کر
اپنے مردہ بچے کو
اشکوں سے نہلا رہی ہے
یہ سوچ کر کہ
اس سے پہلے
خاقان ایک اور دھماکہ کر کے
اس کو ڈرا کر بھگا دے یا مار دے
وہ بچے کو پتوں کا کفن اُڑھا کر
اَدھ جلی زمین میں دفن کر دے!

پھر ہوا ایسا کہ
ایک اور بم پھٹ گیا
نہ درخت رہا، نہ بیوہ، نہ بچہ
اور نہ پتے!!!

OO

بس ایک لمحہ

آج کی صبح نرالی ہے اور سہانی بھی!

آج جج صاحب کی آنکھیں کانچ کے ٹکڑوں کی مانند بے جان سی نظر نہیں آ رہی تھیں بلکہ ان میں چمک ہے۔ شاید اس لیے کہ ان میں مشاہدے کی قوت لوٹ آئی ہے اور وہ بڑے اشتیاق سے نیلے آکاش میں تیر رہے بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھ کر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اسپتال کے کمرے کے ساتھ والے برآمدے میں اپنی بیوی کو بادلوں کے ٹکڑوں سے بنتی بگڑتی شکلیں دکھا کر کہہ رہے ہیں کہ وہ بھی اس کے چہرے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے کی بجائے بادل کے ٹکڑوں کو غور سے دیکھ لے تاکہ وہ بھی کبھی بندر، کبھی ہاتھ، کبھی شیر، کبھی دودھ پلا رہی ماں اور ماں کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اُچھلتے ہوئے بچے کو دیکھ سکے۔

یہ جج صاحب کا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا جو تقریباً دو سال پہلے چھوٹ گیا تھا، آج ان کے چہرے پر تناؤ کے اثرات تھے اور نہ کسی قسم کا تجسس یا اپنے اِرد گرد اپنے ہی گھر والوں کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کا تذبذب۔ سانسیں راحت کا احساس یوں دلا رہی ہیں گویا ایک عذاب دہ پھوڑا خود بخود پھٹ چکا تھا اور تکلیف دِہ پیپ ایک لمحے میں نکل کر ایک اذیت ناک دور کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ بیوی یہ دیکھ کر سوچ رہی ہے کہ کاش یہ کرشمہ تھانے میں ہوا ہوتا تو گھر کی بات گھر والوں تک ہی محدود رہ جاتی!

جو بھی بُرا یا اچھا ہونا تھا وہ تو ہونا ہی تھا۔

ایک پڑھے لکھے بزرگ کی غیر شائستگی اور انگریزی میں غیر مہذب جملوں کا استعمال کسی کو بھی اُکسا کر سخت قدم اُٹھانے پر مجبور کر دیتے۔ خاص طور پر تب جب وہ اپنی ہی بیوی کے خلاف آگ اُگل رہے ہوں۔

ہوا یوں تھا کہ پولیس نے ایک عجیب گیٹ اپ میں ایک شخص کو ایک پارک میں بدیشی سیاحوں سے کسی موضوع پر انگریزی میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا تو رسمی پوچھ تاچھ شروع کی تھی تو

جھاڑیوں کے پیچھے بناوٹی جوانی کا لبادہ پہنے ایک بزرگ عورت کو دوڑ کر جج صاحب کے بچاؤ کے لیے غار سے نکلے شیر کی طرح پولیس والوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ کہہ گئی کہ جج صاحب ان کے شوہر ہیں مگر جج صاحب نے انکار، احتجاج اور پھر عورت کو ایک اجنبی بازاری عورت کہہ کر اس پر ورغلا کر لے جانے کی خاطر اس کا گھر سے پیچھا کرنے والی چڑیل کہہ کر ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا اس لیے پولیس نے دونوں کو مشکوک کردار سمجھ کر گرفتار کر لیا تھا۔ عورت نے اپنے موبائیل فون سے بات کرنی چاہی تو کوئی حالات کا فائدہ اٹھا کر اس کا فون چھین کر بھاگ گیا تھا۔ تھانے دار نے جب دونوں کو تھانے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو دونوں کا حلیہ دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

جج صاحب نے ایک جدید فیشن کا کُرتا پہن رکھا تھا اور وہ یوں نظر آ رہا تھا گویا ایک موٹے تکیے پر ایک تنگ غلاف چڑھا دیا ہو۔ ایسا ہی ان کی ٹانگوں پر ایک بہت ہی تنگ جینس میں لگ رہا تھا۔ عورت کی تو اس سے بھی بدتر حالت تھی۔ بے چمک سفید بالوں کو ایک ماڈرن اسٹائل میں سجایا گیا تھا۔ پچکے گالوں پر گلابی پچ، سوکھے اندر دھنسے ہوئے ہونٹوں پر لپ اسٹک سوکھے تالاب جیسی آنکھوں میں کاجل اور پھر ایک تنگ جیکٹ سے باہر آئے اس کے پستان جو دو سفید کبوتروں کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے، چھو کر باہر ایک لمس کی دعوت دینے کی بجائے آزاد رہنے کی فریاد کر رہے تھے!

اپنی غیر سنجیدگی پر قابو پا کر جب تھانیدار نے بیان قلم بند کرنے سے پہلے سسک رہی عورت سے پوچھ تاچھ کرنی چاہی تو وہ سسک سسک کر ہر سوال کے جواب میں التجا کرتی رہی کہ اس کو اپنے بیٹے کو فون کرنے کی اجازت دیں۔

تھانیدار نے نمبر دیکھا تو ممبئی کے ایک پاش علاقے کا نمبر تھا اس لیے اس نے اپنائیت کا احساس دلا کر کہانی کرید کرید کر جان لی۔

جج صاحب ایک نہایت ہی قابل سیشن جج تھے جو سبکدوش ہونے کے بعد ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے وہ بھی نیویارک میں جہاں وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس گئے تھے۔

جج صاحب منصف بن جانے کے بعد بہت کم بولتے تھے اور صبح سویرے سیر پر جانے سے پہلے کسی دیوی دیوتا کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر پوجا پاٹ کرنے کی بجائے ایک آئینہ سامنے رکھ کر اپنے آپ سے باتیں کیا کرتے تھے اور عہد کیا کرتے تھے کہ جو بھی آج کروں بھگوان کو حاضر ناظر

رکھ کر سچ کی بنیاد پر کروں۔ یہ عادت تب تک جاری رہی جب تک وہ ایک بھیانک حادثے کا شکار ہو کر اپنی یادداشت کھو بیٹھے تھے اور گھر والوں کو ان کی یہ عادت چھوٹ جانے سے اس حقیقت کی تصدیق ہو گئی تھی کہ گھر میں رہ کر بھی اپنے گھر والوں کو اجنبی سمجھ کر بار بار یہ کیوں پوچھ لیتے ہیں کہ آپ کون ہیں؟ بلکہ وہ اجنبیوں سے نہایت گرم جوشی سے ملا کرتے تھے۔ حال چال یوں پوچھ لیا کرتے تھے گویا برسوں سے ان کو جانتے ہوں مگر اچانک بات چیت کا سلسلہ روک کر یہ پوچھ کر ہم کلام پر برق گرا دیا کرتے تھے کہ بائی دی وے آپ کون ہیں؟ کچھ تو ایسے بھی تھے جو اِسے بزرگ کا اندازِ بیان سمجھ کر لطف اندوز ہوا کرتے تھے مگر گھر والوں کو ان میں ایک بدلے بدلے انسان کو دیکھ کر دہشت ہوا کرتی تھی۔

جج صاحب لڑکپن سے آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے خوبصورت چہرے کو دیکھا کرتے تھے۔ پھر کالج کے ایک رومانی ہیرو کی طرح گھر سے نکل جانے کے بعد اور لوٹنے کے بعد آئینہ دیکھا کرتے تھے۔ سمجھ دار لوگوں کو یقین تھا کہ لڑکا نرگسیت کا شکار ہے یعنی اپنی ہی صورت پر فدا یا عاشق ہونے والا شخص (بحوالہ ایک یونانی کہانی) ہے جبکہ عام لوگ ایسی عادت کو عیب کا نام دیا کرتے تھے۔

جج صاحب کے ذہن میں گزرے ہوئے دنوں کی یادیں، رشتے ناطے بلکہ رہنے والے لوگ اور ماحول بھی سب کچھ ایک خواب کی مانند ہوا کرتا تھا، یعنی پلکیں کھلنے سے بند ہونے تک ہی سامنے رہا کرتا تھا۔ امریکہ میں مقیم ان کے بیٹے علاج کے لیے والدین کو اپنے ساتھ امریکہ لے گئے مگر یہ جان کر کہ وہ اجنبی چہروں کے جنگل میں ڈرے ڈرے رہا کرتے تھے اس لیے ان کو ممبئی میں ان کے دوسرے بیٹے کے پاس بھیج دیا۔

ممبئی میں ان کو یہ فائدہ ہوا کہ گھر میں نوکر چاکر تھے، ڈرائیور ان کو کار میں دن بھر گھمایا کرتا تھا، وہ اگر کسی اجنبی کو دیکھ کر چونک پڑتے تو کار روک کر ان کو بات کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ مگر ہر بار ایک نہایت خوش گوار ملاقات اسی جملے پر ختم ہو جایا کرتی تھی ’’By the way آپ کون ہیں؟‘‘ گویا کسی یگانے یا بیگانے سے جج صاحب کا خود ملنا یا ملوانا بار بار ایک مذاق یا پھر ایک صدمہ بن جایا کرتا تھا۔

ڈاکٹروں کے ہی مشوروں پر ایک کمرے میں قدِ آدم آئینہ رکھ دیا گیا تاکہ کسی آئینے میں جج صاحب کی نرگسیت کی کونپلیں پھوٹ کر آ جائیں اور وہ اپنی کھوئی یادداشت کو آوازیں دے کر

بلاکیں! اس کے علاوہ ان کے سامنے ماضی کے قصے اور واقعات سنائے جاتے بلکہ پرانے البم دکھائے جاتے۔ گھر کا ہر فرد کچھ نہ کچھ سناتا رہتا اور اسی کوشش میں بیوی نے اپنی شادی کی تصویریں دکھائیں، جس سے اُمید کے اشارے دیکھنے کو مل گئے۔

ایک منصوبے کے تحت بیوی، جج صاحب کو اپنے پوتے کے کپڑے پہنا کر پارک میں چھوڑ آئی جبکہ خود اپنی پوتی کے کپڑے پہن کر ایک جوان لڑکی کے گیٹ اپ میں وہ منظر دُہرانے کی کوشش کرنے کی تیاری کرنے لگی۔ منظر کو دُہرانا مشکل تو نہیں تھا۔ دونوں کی ٹکر ہوئی تھی جس کی وجہ سے ایک بے حد خوبصورت سولہ سال کی لڑکی کے گاگلز (دُھوپ کا چشمہ) گر کر چکنا چور ہو گیا تھا اور بیس سال کے قانون کی پڑھائی کرنے والے لڑکے کو لڑکی کی پُرکشش آنکھوں میں اپنی صورت ویسی ہی نظر آتی تھی جیسے وہ آئینے میں اپنا خوب صورت چہرہ دیکھا کرتے تھے۔

اور یوں پچاس سال پہلے ایک لڑکی کی آنکھوں کی آگ پر گویا برف پڑ گئی تھی۔ چاہت کا جذبہ اُبھر کر آتے ہی محبت کی لہریں بن کر عشق کی سہانی آنچ بن گیا۔

امید تو تھی کہ تجربہ کامیاب رہے گا مگر ہوا اس کے برعکس۔

جج صاحب تھانے سے لوٹ کر آئے تو آئینے میں اپنا ہی عکس دیکھ کر چلانے لگے۔ کون ہے تو؟ اور لرزش کی وجہ سے وہ پیچھے جاتے ہوئے اپنا توازن کھو کر گر پڑے۔ فرش پر گرتے ہی ایک زور کی آواز دوسرے کمرے میں سنائی دی۔

چند روز بعد جج صاحب اسپتال میں اپنے کمرے کے برآمدے میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اپنی بیوی کو نام سے آواز دے کر کہنے لگے "آئینہ ایک کیمرہ نہیں جو تصویریں کھینچ سکے اور ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ آئینوں میں پانی کی طرح عکس نظر آتے ہیں مگر پانی بہہ کر عکس اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ میں تمھاری آنکھوں میں اپنے تاثرات کے عکس دیکھ کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ موٹر سائیکل والے کا نمبر مجھے یاد ہے لیکن بتاؤں گا نہیں کیونکہ حادثہ میری غلطی کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ بے قصور ہے۔ سزا تو مجھے ملنی چاہیے۔"

بیوی خوشی سے اُچھل پڑی اور موبائل کا جونہی بٹن دبانے لگی تو جج صاحب نے ٹوکا "کہاں کا نمبر ملا رہی ہو، نیویارک یا ممبئی کا؟ کہیں تم نے ان کو میرے حادثے کے بارے میں کچھ کہا تو نہیں؟"

بیوی کا چہرہ اُتر گیا اور وہ خیالات، احساسات، جذبات اور خدشات کے دائروں میں سمٹ

کر ایک گرداب میں پھنس گئی، اس لیے کہ اگر وہ دو سال سے ہو رہے عذاب شدید کے بارے میں سب کچھ بتادے تو شاید جج صاحب کی یادداشت پھر چلی جائے۔

آئینے کی آڑ میں اس نے اپنی پھول رہی سانسوں پر قابو پا کر کہا "ہاں آئینہ جھوٹ بھی نہیں بولتا۔ پوچھ لیجیے آئینے سے کہ کیا حادثے کے بعد آپ نے کہا تھا کہ ممبئی فون کر دو تا کہ وہ اپنا کام کاج چھوڑ کر میرا یہاں علاج کروانے کی بجائے آ کر ہمیں ممبئی لے جائے! بلکہ ضد بھی کی تھی، بچوں کی طرح!"

جج صاحب گھنٹہ بھر آئینہ دیکھتے رہے اور پھر اپنی مرجھائی ہوئی آنکھوں، پچکے گال اور اپنے سفید چھوٹے چھوٹے بال دیکھ کر پہلے مسکراتے رہے اور پھر جب بے ساختہ ہنسی قہقہوں میں بدل گئی تو اپنے قہقہوں کی بے پَر کی پَر بولتے رہے۔ "تم بوڑھی ہوگئی ہو، پھر بھی یادداشت تروتازہ ہے۔ میں بھی بوڑھا ہو گیا ہوں مگر یادداشت خزاں آلودہ ہے۔ یاد ہی نہیں آرہا کہ میں کیوں ممبئی آنے کی ضد پر اڑا رہا۔ شاید بوڑھاپے میں ایسا ہی ہوتا ہوگا۔"

میاں بیوی قہقہے لگاتے رہے مگر بیوی کے قہقہے کھوکھلے تھے! کیونکہ وہ شاد بھی ہے اور ناشاد بھی۔ وہ جان چکی ہے کہ اس کے شوہر کی یادوں میں دو سال کا عرصہ گویا ڈھل گیا ہے!

OO

محیط

اپنے شہر سے بہت دُور، گھنے جنگلوں کے درمیان ایک بیابان میں رات کے آخری پہر جب وہ چار ہم سفر سوئے تھے تب ان کا پانچواں ہم سفر گہری نیند سو رہا تھا مگر صبح سویرے جب وہ اپنا سفر جاری رکھنے کی خاطر جاگ پڑے تھے تو وہ وہاں نہیں تھا۔ آس پاس بھی نہیں تھا بلکہ دُور دُور تک بھی وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے چاروں مسافر حیران بھی تھے اور پریشان بھی تھے۔ اس کے بارے میں چاروں کے دل و دماغ میں شکوک طرح طرح کے سوالیہ نشان بن کر اُبھر رہے تھے اور ان کو ڈرا بھی رہے تھے!

دن بھر وہی تو تھا جو اذیت ناک سفر کے دوران بولتا رہتا تھا اور اپنے اجنبی ہم سفروں کی خاموشی توڑنے کی خاطر نرم گرم لہجے میں، منحنی پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے اور ہانپتے ہوئے بھی، بول بول کر چاروں کو اپنائیت کا احساس دلاتا رہا تھا۔ وہی تو تھا جو ان کو اس بیابان میں رات گزارنے کے لیے لے آیا تھا۔ وہی تو تھا جس نے اپنے ہم سفروں کو یہ احساس دلایا تھا کہ محیط سے ہی دائرہ بن جاتا ہے، محیط کے پھیلاؤ سے تنگ دائرے وسیع دائرے بن جاتے ہیں۔

دائرہ ایک قید خانہ بھی ہوتا ہے اور ایک محفوظ آسرا بھی! اس بیابان میں رات کا پہلا پہر گزر جانے تک وہ چاروں اجنبیت کے ماحول میں ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھ کر ایک دوسرے سے خوف زدہ تھے اور ایک دائرے کے اندر یوں بیٹھے تھے گویا سیماب کے چار لرزتے ہوئے، بے چین قطرے جو پاس ہوتے ہوئے بھی ذرا سی جنبش سے قریب آنے کی بجائے دُور ہو کر محیط سے ٹکرا کر دائرے کے باہر بھی نہیں جا سکتے تھے کیونکہ محیط پر پانچواں آدمی سانپ کی طرح کنڈلی مار کر سو رہا تھا مگر اُسی کی وجہ سے چاروں کے درمیان فاصلے کم ہو گئے تھے اور چاروں ایک قطرہ بن کر ایک دوسرے میں سما گئے تھے۔

انھوں نے اس کو بابا کا نام دیا تھا اور اس کے لیے اپنے دلوں میں جمع ساری میل دھو کر اس کی باتوں پر سنجیدگی سے غور بھی کیا تھا لیکن صبح اُجلی کرنوں نے بابا کے بارے میں ان کے شکوک کو

یقین میں بدل تو دیا تھا مگر پھر بھی چاروں بابا کے پُر اسرار وڈرامائی کردار کے بارے میں سوچ سوچ کر اندیشوں اور صدمات کی عمیق گہرائیوں میں کبھی ڈوبتے رہے اور کبھی پانی کی سطح پر سہانی آتی جاتی لہروں کو دیکھتے رہے۔

چاروں کی کیفیت ایک جیسی تھی بالکل ویسے ہی جیسے ان کی ذاتی داستانیں ملتی جلتی تھیں! جبھی تو طرح طرح کے سوال اُن سے جواب مانگ رہے تھے:

- کیا بابا ان کو ہانک کر اس بیابان میں لایا تھا؟ مگر کیوں؟
- کیا بابا ایک ستمگر ہے جو ستم زدہ کے بھیس میں ان کو اچھی اچھی باتیں سنا سنا کر غلط راستوں پر چلاتا رہا تھا؟ مگر کیوں؟
- کیا بابا ان کو موت کے منہ میں ڈال کر اپنا کام کر گیا تھا یا وہ ان کو ملک الموت کے شکنجے سے آزاد کرانے کے بعد چلا گیا تھا؟

سچ تو یہ ہے کہ کل دن بھر بابا بولتا رہا اور باقی چاروں مسافروں نے اپنے ہونٹوں پر مہر خاموشی لگادی تھی اور شام ہوتے ہی بابا نے ایک فوجی گروپ کے کپتان کی طرح رات بھر پہرہ داری کے لیے سب کو دو دو گھنٹے کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ یعنی ایک جاگتا رہے گا اور باقی چار سو جائیں گے۔ کب کس کی باری ہوگی یہ بھی بابا نے ہی طے کر دیا تھا! یوں جس کی باری پہلے تھی وہ چاند کی روشنی میں بار بار بابا کے لمبے بال دیکھ کر اندر ہی اندر اُبل رہا تھا، پیشے سے نائی ہونے کے سبب جانے اُس پر کیوں ایسی کیفیت طاری ہوگئی تھی کہ اس نے بابا کے لمبے بال قینچی سے کتر دیے اور بابا کو معلوم ہی نہ پڑا تو نائی نے پھر اس کی بدلی بدلی صورت دیکھ کر اس خوفناک شکل کو دیکھنے کی کوشش کی تھی جو اس کو ایک سال پہلے تب ملا تھا جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سرحد پار کر کے اپنے وطن لوٹ کر آیا تھا۔ اس ذہنی کشمکش یا تناؤ کی وجہ سے اس نے رفتہ رفتہ بابا کے سر پر ولایتی کریم لگا کر اُسترا پھیر دیا تھا۔ گویا اس نے روپہلی روشنی میں ایک اور چاند کو دیکھا تھا تب وہ سنجیدہ ہو کر اپنی اس احمقانہ حرکت پر نادم ہوا تھا۔ ایک گہری نیند سو رہے، تھکاوٹ سے چور چور ہوئے بزرگ کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔

نائی کی پہرہ داری یا بقول بابا نگہبانی کی مقرر کی گئی میعاد پوری ہوتے ہی جب اس نے بابا کو جگایا تھا تب بابا نے جمائی لیتے ہوئے جونہی اپنے سر پر ہاتھ پھیرا وہ غصے سے چلّایا تھا: ”ارے بے وقوف تم لوگ بولتے نہیں یہ تو میں جان گیا تھا لیکن تم سنتے بھی نہیں ہو یہ اب جان گیا ہوں؟ بھلے

آدمی تمھارے بعد میری باری تھی اور تم نے گنجے کو جگا دیا! گنجے کو سو جانے دو! اور مجھے جگا دو!'' اور یہ کہہ کر بابا سو گیا تھا! یہ ڈرامائی منظر دیکھ کر نائی بے ساختہ ہنستے ہنستے چونک پڑا تھا، حیران ہونے کے ساتھ ساتھ وہ یہ جان کر پریشان بھی ہوا تھا کیونکہ جن تین ہم سفروں کو وہ سویا پڑا سمجھ رہا تھا وہ جاگ رہے تھے اور نائی کی بے ہودہ حرکت دیکھ بھی چکے تھے۔ تذبذب کی کیفیت اُس پر اس لیے حاوی نہیں ہوئی تھی کیونکہ ان میں نہ کسی نے اس کو روکا ٹوکا تھا اور نہ اُچھل کر حیرت کا اظہار کیا تھا بلکہ سبھی ہم آہنگ ہو کر بے ساختہ ہنس پڑے تھے! گویا ایک ہلکی سی جنبش سے سیماب کے چاروں قطرے مل کر ایک ہی قطرہ بن گیا تھا اور وہ محیط سے بار بار ٹکرا کر دائرے کے باہر جانے کی کوشش کرتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا!

- بابا مفکروں کی طرح باتیں کرتا تھا۔ کیا وہ کوئی جوگی مستانہ تھا؟
- آج کل تو سادھو سنتوں، پیروں فقیروں کا عمل ان کے قول سے الگ ہے۔ باتیں امن کی اور تیاریاں جنگ کی!
- وہ اگر جاسوس یا مخبر ہے تو کس کا؟ سرکار کا یا تخریب کاروں کا؟
- بھیس بدل کر راون سیتا کو اُٹھانے آیا تھا یا کوئی اوتار جنم لے کر راکھشسوں کو مارنے آیا تھا۔ مگر گیا کہاں؟ بڑبڑاتے ہوئے انھوں نے خود ہی خاموشی کو توڑ کر پہلے جھجک جھجک کر پھر کھلے دل سے باتیں کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا تو بابا کی وہ باتیں دہراتے رہے جو وہ ان کو گزرے کل سحر سے شام تک سناتا رہا تھا۔ کبھی چاروں کے قدم سے قدم ملا کر، کبھی آگے آگے چل کر اور کبھی پیچھے سے صدائیں دیتے ہوئے، کبھی جوش کے ساتھ، کبھی طیش میں آ کر، کبھی آہیں بھرتے ہوئے اور کبھی قہقہے لگاتے ہوئے۔
- نام نہیں بتانا چاہتے تو نا سہی۔ مگر کچھ تو بولو؟
- نام میں کیا رکھا ہے بلکہ نام ہی تو انسان کو ہندو یا مسلمان بنا دیتا ہے، برہمن یا ہریجن بنا دیتا ہے، سنّی یا شیعہ بنا دیتا ہے!
- یہ تو بتا دو کہ بچھڑ کر آج مل گئے ہو یا مل کر بچھڑ رہے ہو؟
  لگتا ہے تم لوگ کسی سے ڈر رہے ہو! کس سے؟ انسان سے؟ کیوں؟
- موت سے کیوں ڈر رہے ہو؟ جو جنم لیتا ہے وہ مر جاتا ہے۔ کون سے پل سانس اندر جائے تو مگر واپس نا آئے! یہ کوئی نہیں جانتا۔

- موت کیا ہے؟ مٹی چھوڑ کر ہوا میں کھڑا ہونا۔ برف کا پگھل کر دُھوپ میں سما جانا! بس اتنی سی کہانی ہے، اتنا سا فسانہ ہے!
- موت سے ڈر لگ رہا ہے تو اُس جسم کو روح سے الگ کر دو جو مر جاتا ہے!
- جسم کو پاک روح پر قربان کر دو اور روح کو عذاب سے بچالو!
- جنگ تو جنگ ہے۔ سرد کیا اور گرم کیا! سپاہیوں کو مرنا ہے اور حکمران کو جشنِ فتح منانا ہے۔ یا لڑو یا مرو! ظلم کے خلاف آوازِ بلند میں خود پر گزری کہانی سنا دو۔ جھوٹ کو سچ کی تلوار سے کاٹ دو! جسم کو عتاب اور روح کو عذابِ شدید سے بچا سکو تو بچالو۔
- فرار ہو کر، یا خودکشی کر کے اپنی پاک روح کو خون خرابہ کر کے تکلیف مت دو! روح دُنیا بنانے والے کی امانت ہے۔ جس کی ہے اس کو لوٹا دو! جسم کو چھوڑ جسم کو چھین کر نہیں!

چاروں مسافروں کی داستانیں ایک جیسی ہیں اور چاروں اپنی جان بچانے کی خاطر اس راستے پر چلتے چلتے اس بیابان میں رُک گئے ہیں جو دو ملکوں کے درمیان واقع ہے۔

یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جب صبح کے وقت، دن کا کام کاج کرنے کی خاطر اپنے گھروں سے نکلنے والوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ شام کو گھر لوٹیں گے یا نہیں! بلکہ گھر میں بیٹھے لوگوں کو بھی یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ رات گزارنے کے بعد سحر کے وقت ان کے گھر میں خوشی ہو گی یا ماتم! دن چڑھنے کے ساتھ بچوں کو اسکول بھیجنے کی تیاریاں ہوں گی یا ان کے باپ کے ابدی سفر کی تیاریاں ہوں گی! دن بھر معمول کی سرگرمیاں ہوں گی یا نوحہ خوانی ہو گی۔

سیاست نے ایک ایسی کروٹ لی تھی کہ ایک بھیانک بھونچال آیا تھا، گھر اُجڑ گئے تھے اور گھر والے شاخ سے جدا ہوئے پتوں کی طرح بکھر گئے تھے! ایسے حالات بن گئے تھے کہ سوال کرنے والا ہی جواب دینے والے کے منہ میں اپنی زبان رکھ کر، جھوٹ کو سچ ثابت کرتا رہتا تھا، بلکہ چند موقع پرست معصوم لوگوں کو جھلسا دینے والے انگاروں پر ڈال کر اپنی کھچڑی پکاتے رہتے تھے اور وطن پرستی کی آڑ میں اپنی کنبہ پروری کیا کرتے تھے۔ مرغی اگر بلّی کو دیکھ کر اپنے چوزوں کو کسی محفوظ جگہ لے جانے کی سعی کرتی تھی تو درخت پر بیٹھی چیل مرغی کو ہی اٹھا کر لے جایا کرتی تھی۔ ایک تحریک، ایک خاص مقصد کے لیے شروع تو ہو گئی تھی مگر اس کی آڑ میں بدکار لوگ اپنے ذاتی مقاصد کے لیے ایسے بیج بو رہے تھے کہ دھان کے کھیتوں میں بھی کانٹے اُگ کر کسانوں کو لہولہان کر دیتے تھے! کسی کو بھی ہٹ لسٹ کا حوالہ دے کر لوٹا جاتا تھا، بھگایا جاتا تھا یا مارا جاتا تھا۔ تحقیق یا

تنقید کرنے کو خود ہی تخلیقات تحریر کیا کرتے تھے، کسی کو کسی پر بھروسہ نہیں تھا، جھوٹ بول کر اپنا بچاؤ کرنا ایک عادتِ عام بن گئی تھی۔ طاقتور لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانا ضرورتِ زندگی بن گئی تھی، دلاسوں اور ہمدردیوں میں مجبوریوں کی چاشنی ہوا کرتی تھی۔ ایک بے شکل کا خوف عام لوگوں کا تعاقب کرتا رہتا تھا اور جب دشمن سامنے آ کھڑا ہوتا تھا تب وہ اپنی جان بچانے کی خاطر نائی کی طرح چھپ جایا کرتے تھے یا سب کچھ اپنے اُجڑے گھروں کو چھوڑ کر اُکھڑے لوگوں کی طرح فرار ہو جایا کرتے تھے یا پھر جلاوطن ہو جایا کرتے تھے۔

اپنے گاؤں سے بھاگا ایک نائی کا بیٹا پڑوس کے ملک میں ایک مشہور ہیئر ڈریسر بن گیا تھا۔ کئی بڑے شہروں کے پانچ ستارہ ہوٹلوں میں اس کے بیوٹی پارلر تھے مگر اس کو عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کے باوجود اپنے وطن کی یادیں ستایا کرتی تھیں اس لیے وہ لوٹ کر آیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے مشہور چوک میں ایک باوقار پارلر کھولنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ بھی سرحد پار کر کے غیر قانونی طریقے سے آیا تھا مگر وہ تخریب کاری کے مقصد سے نہیں آیا تھا۔ شہر کی شائستہ عورتیں اور لڑکیاں اس کی دُکان پر بلا جھجک آیا کرتی تھیں۔ اور وہ شرافت کا ایک نمونہ تھا جس کو کوئی بھائی جان، کوئی چاچا جان، کوئی ماموں جان کے نام سے یاد کرتی تھیں۔ وہ واپس جانا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے اپنے رشتے کے بھائی جنھوں نے اس کی موروثی جائیداد ہڑپ لی تھی اس کو بھگانے کی خاطر غیر وطنی تخریب کاروں کی مدد لے رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم وطن اس کی حفاظت کرتے اس کی دُکان جلا دی گئی تھی۔ وہ اپنے گھر پر کام کرتا رہا تو اس کو دھمکایا گیا اور پھر وہ منحوس دن آ ہی گیا جب اس کے دشمن المناک حالات کی آڑ میں اس پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ تب وہ اپنی منہ بولی بہن کے بال سنوارنے اُس کے گھر گیا تھا اس لیے اس کو مخبر کا نام دے کر، اس کے نام کے ساتھ غدار لگا کر اس کو قتل کرنے کا حکم جاری ہوا تھا۔ جب گئی رات وہ اپنے گھر پہنچا تھا تب اس کا گھر بندوق والوں کے قبضے میں تھا۔ خوف زدہ ہو کر وہ گلیوں کے جال سے نکل کر پہاڑی کے دامن پر پہنچ گیا تھا۔ اور دوڑتا بھاگتا ایک چنار کے درخت کے آس پاس چھپ کر سحر کا انتظار کر رہا تھا۔ اُفق پر کھڑی سحر کو دیکھ کر جب وہ پھر بھاگنے لگا تھا تب اس نے بابا کے اِردگرد بیٹھے تین اور لوگوں کو دیکھا تھا جو اس کو دیکھتے ہی جنگل کی طرف بھاگنے لگے تھے۔ بابا چاروں آدمیوں کے کبھی آگے کبھی پیچھے چل کر، دوڑ کر یا ہانپ کر چاروں کو کچھ نہ کچھ بتاتا رہتا تھا۔ چاروں اس کی باتیں سن بھی لیا کرتے تھے مگر اپنے لبوں پر مہرِ خاموشی لگا کر۔

نائی کے ساتھ بیٹھا گنجادرمیانی عمر کا ایک کاروباری آدمی تھا جو قالین برآمد کیا کرتا تھا۔ بچپن میں اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے وہ قالین بنایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ بینک سے قرضے لے کر خود قالین بنا کر اپنے کئی شوروموں میں تجارت کرنے والے سے اپنے ہی رشتے دار قہر کی حد تک حسد کیا کرتے تھے۔ پہلے تو انھوں نے اس کی دُکانیں جلا دیں تھیں پھر مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔ بچاؤ کے لیے فقط یہ تجویز یا حکم تھا کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی اپنے ایک ملازم کے بیٹے سے کردے۔ کیونکہ اس نے حکم کی تعمیل کرنے کی بجائے اپنے گھر والوں کو لندن بھیجا تھا اس لیے وہ ہٹ لسٹ پر آ گیا تھا۔ اگر کسی نیک انسان نے اس کو قاتلوں کے گھر میں گھسنے کی اطلاع نہ دی ہوتی تو وہ پُرانے زمانے کے شکست خوردہ راجاؤں کی طرح بھیس بدل کر ملک الموت کو چکمادے کر آدھی رات کو بھاگنے میں کامیاب نہ ہوا ہوتا۔ راجے سونا دے کر اپنے بھاگنے کا رختِ سفر خریدا کرتے تھے اور اس بدبخت شخص نے ایک سائیکل والے کو اپنی کار دے کر بھاگ جانے کی سواری خرید لی تھی۔ تیسرا آدمی ایک مصوّر ہے۔ اس کا پردادا شخصی راج میں ایک جلاد تھا اور اس نے آزادی سے پہلے جس انقلابی کے گلے میں پھندہ ڈالا تھا اس کے پڑپوتے کو کسی نے تواریخ کے اوراق کے حوالے دے کر اُکسایا تھا کہ اس کا حریف دراصل اس کا وہ دشمن ہے جس کو قوم معاف نہیں کرسکتی اس لیے وہ اس کو جلاوطن کردینا چاہتا تھا یا پھر قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس کو اپنے انجام کا پتہ بھی نہ چلا ہوتا اگر بندوق والے اس کے بدبخت ہم نام کو اس کے گھر میں گھس کر بے رحمی سے قتل نہ کردیتے! وہ جانتا تھا کہ جس کا پردادا جلاد تھا وہ تو مقتول نہیں تھا اس لیے وہ خدشات کا بھاری بوجھ اٹھا کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ گیا تھا۔ چوتھا مسافر بے بس، بے کس ہونے کے ساتھ اس قدر معصوم تھا کہ وہ اپنے باپ کو ہی اپنا دشمن سمجھ رہا تھا کیونکہ باپ نے ہی بیٹے کو گھر سے زبردستی نکال کر کہیں دور جانے کے لیے مجبور کیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس کو یہ ڈر تھا کہ انقلابی اس کو ٹریننگ دے کر اپنی تنظیم میں شامل کرلیں گے۔ اس لیے بھی نہیں کہ لڑکے کے ایماندار دادا نے ۳۵ سال پہلے اپنے گھر میں دھوکے سے پناہ لینے والے ایک بدیشی گھس پیٹھیے جنگجو کو پولیس کے حوالے کردیا تھا، بلکہ اس لیے بھی نہیں کہ اس کا باپ ایک اعلیٰ افسر ہونے کے ساتھ مذہب پرست تو ہے مگر فرقہ پرست نہ ہونے کے سبب انقلابیوں کا دوست نہیں بن سکا تھا۔ پسِ پردہ کہانی ایک سازش کا جز تھا۔ اپنے بیٹے کے آئی۔اے۔ایس کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کرنے کو ہی اس کی موت کا حکم سمجھا تھا۔ کیونکہ اس کے بیٹے کی قابلیت سے رشک کرنے والوں کی تعداد کم تھی اور حسد کرنے والوں کی

تعداد میں اس کے پڑوسی بھی شامل تھے۔ انھوں نے یہ خبر اُڑا دی تھی کہ اس خاندان کو اس لیے آگے کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے کیونکہ وہ اپنی قوم کے خلاف کام کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ جب بیس سال کا مہذب نوجوان نہایت شائستگی سے اپنی روداد سنا چکا تھا تب رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ چاروں جذبات کی شدت برداشت نہ کر کے رو پڑتے۔ مگر بابا جاگ پڑا اور معمول کی طرح اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر بڑبڑا کر سو گیا۔ گہری سوچ میں ڈوبے چاروں ہم سفروں کو بار بار بابا کی وہ باتیں یاد آتی رہیں جو وہ ان کو دورانِ سفر سنا چکا تھا۔ اور ہر بار ان کو بابا کی باتوں میں عمیق گہرائی محسوس ہوتی رہی۔

گویا بابا کی آواز کی گونج اُبھر جایا کرتی تھی اور پھر فضا میں ڈوب جایا کرتی تھی۔

''آخر کسی دن تو یہ جسم چھوڑنا ہی ہے۔ یہ جسم آتما پر ایک بوجھ ہی تو ہے۔ اُترنے دو یہ بوجھ؟''

''لوگ نجات پانے کے لیے جنگلوں میں جاتے ہیں۔ ایسا ہوتا تو کیا وحشی درندے مہاتما نہیں بن جاتے کیا؟ برگد کے پیڑ یا چنار کے درخت کے نیچے بیٹھ کر سکون ملتا تو جڑوں میں چھپے بیٹھے ناگ سکون سے کیوں نہیں زندگی گزارتے۔''

''سکون دینے والے درخت اپنی آغوش میں دہشت گردوں کا سامانِ جنگ کیوں چھپا لیتے ہیں؟ ایک لوہے کا تیز دھار والا ٹکڑا تب درخت کو کاٹنے والی کلہاڑی بن جاتا ہے جب لکڑی کا ایک ٹکڑا اس کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔''

''ارے بھائی قاتل قتل کرتا ہے تو جنم دینے والا ہی تو دونوں کی جنم کنڈلی بناتا ہے۔ کس کو مرنا ہے، کون مارے گا یہ تو مقدّر کی بات ہے۔''

''جلاّد کا کیا قصور اگر وہ پھانسی کا پھندہ مجرم کے گلے میں ڈال دے، وہ تو بے چارہ حکم کی تعمیل کرتا ہے! قاتل بھی قتل تب کرتا ہے جب تقدیر لکھنے والا اس کو اسی کام کے لیے دنیا میں لے آتا ہے۔ اپنے کرموں کا پھل بھگتنے کے لیے۔ جنگ میں ایک سپاہی مرتا بھی ہے مارتا بھی ہے۔ جو مارتا ہے اس کو قاتل کی بجائے غازی، سورما، دیش بھگت کے القاب کیوں دیے جاتے ہیں۔ اور مرنے والے کو جنت یا جہنم، سورگ یا نرک بھیجا جائے یہ تو دنیا بنانے والے کے لیے ہم ایک معمہ کیوں بنا دیتے ہیں؟ معمہ اس لیے کہ ایک ہی انسان ایک ساتھ اچھا اور بُرا ہو سکتا ہے۔ شہید اور غدار ہو سکتا ہے؟''

''جنگ تو جنگ ہے! سرد کیا اور گرم کیا؟ چھپ چھپ کر گھس پیٹھ کر کے کیا اور بارڈر پر کیا؟

شہر کی گلیوں پر کیا گاؤں کے کھیتوں میں کیا؟ محلوں میں کیا اور گھروں میں کیا؟ بھائی بھائی کے ساتھ کیا؟ دوست دوست کے ساتھ کیا؟ ہر جنگ میں سپاہی ہی تو مرتے ہیں! جیت ہار حکمرانوں کی ہی تو ہوتی ہے! پھر ہٹلر خودکشی کرے یا اشوک بودھ بھکشو بن جائے! مرنے والے مرجاتے ہیں۔ وِدھاتا نے ان کی تقدیر ہی ایسی لکھی ہے نا!'' ایسی باتیں بے دلی سے سن کر آج بھی چاروں اپنے بارے میں سوچتے رہے اور اگلے لمحات کا اپنے پھولتے ہوئے سانسوں پر قابو پا کر یہ چاہتے تھے کہ کوئی ان کو چپ کرا کر ان کے سوزِ نہاں کو کم کرنے میں مدد کرے۔

مگر کون کرے گا یہ کام۔ ان کو ایک دوسرے پر بھی بھروسہ نہیں ہے۔ ان میں ایک وہ ہے جو ایک اسکول ماسٹر ہے۔ اُس کا دادا شخصی راج میں ایک جلاد تھا جس نے وطن پر مٹنے والے کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالنے سے پہلے ہی کالی ٹوپی چہرے پر ڈال کر اس کی دُنیا تاریک کردی تھی اور تب اُس کی سانس چل رہی تھی! کیا گزری ہوگی تب اس نوجوان پر۔ یہ سوچ کر اس کے پڑپوتے کا خون اُبل پڑا تو اس کو اُکسانے والوں نے، تواریخ کے واقعات کے حوالوں سے غریب اسکول ماسٹر کا پتہ بتادیا اور یوں اُس کے دروازے پر اس کی موت کا حکم چسپاں کردیا گیا۔

دوسرے آدمی کے دادا نے اس کے اپنے، سرحد پار رہنے والے بھتیجے کو ۱۹۶۵ء کی لڑائی میں مار ڈالا تھا۔ اس لیے قالین بنانے والے ایک ہنرمند تاجر کو سرحد پار سے آئے ہوئے ایک رشتے دار نے اس کو ویسے ہی بے رحمی سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔

تیسرے آدمی کو مار ڈالنے کی دھمکی اس لیے دی گئی تھی کیونکہ اس نے اپنے پڑوسی کی بیٹی کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی جب ایک اجنبی کو اس سے زبردستی شادی کرانے کی خاطر دولہا بنا کر لایا گیا تھا۔

چوتھے آدمی، بلکہ لڑکے کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ جبکہ اس کے والد رائے عامہ کی نمائندگی کرنے والے ایک مقبول رہنمائے قوم ہیں، اس کو کیوں اپنے گھر والوں نے ایک فون سن کر گھر چھوڑ کر بھاگ جانے کا حکم سنایا تھا۔ اس کو گھر چھوڑنے سے زیادہ یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ اس کو دو دن بعد دہلی کے آئی آئی ٹی میں داخلہ لینا تھا۔ اس کو بار بار اپنے خوابوں کی تعبیر لرزتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ بی ٹیک کے بعد آئی اے ایس اور اس کے بعد ایک عزت دار و ایماندار سرکاری افسر بن کر عوام کی خدمت یعنی ایک سنہری باب کا آغاز۔

دائرے میں رہ کر، اپنے قریب آرہے سکڑ رہے محیط کو دیکھ کر چاروں اُس فلسفی کے اصلی چہرے اور اس کی باتیں یاد کرتے کرتے اچانک چاروں کے حلق کو چیر کر اس کا آخری جملہ یاد

کرتے ہی یوں نکل پڑا گویا ایک گلیشر کا ٹکڑا سمندر میں گر پڑا ہو! ایک آواز گونج پڑی اور برف کا ٹکڑا (Iceberg) سطح پر آ کر پانی میں تیرنے لگا۔ اس بار چاروں سمجھتے رہے کہ فلسفی سو رہا ہے۔ مگر وہ جاگ رہا تھا اور چاروں کی باتیں سن رہا تھا۔ دراصل بے ساختہ ہنسی کے بعد چاروں پہلے جھجک جھجک کر بولتے رہے اور پھر یوں بولتے رہے کہ یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ کون بول رہا ہے مگر وہ سب کے دل کی بات جان گیا۔

ایک دوسرے سے ڈرنے والے ایک دوسرے سے چپک کر یوں باتیں کرتے رہے گویا بچھڑے ہوئے لوگوں کو قسمت نے ملا دیا ہو! آخر کون ہے جو اُن کی جان کے پیچھے پڑ گیا ہے؟ وہ یہ سوال بار بار ایک دوسرے سے پوچھتے رہے! اور یوں رات گزر گئی۔

صبح سویرے نائی نے ان کو جگانا چاہا تو گہری نیند سے چاروں جاگ پڑے اور یہ دیکھ کر حیران و پریشان ہو گئے کہ جس دائرے میں وہ رات بھر رہے تھے اس کی محیط ٹوٹ چکی ہے۔ بابا وہاں موجود نہیں تھا بلکہ آس پاس بھی نہیں تھا۔ چاروں بڑبڑاتے رہے۔

- مخبر تھا۔ مگر کس کا؟ سرکار کا یا شر پسند عناصر کا؟
- دشمن تھا۔ مگر کس کا؟ کہیں ہم چاروں کا دشمن تو نہیں تھا؟
- ماں کہا کرتی تھی۔ کیا جانے کس رُوپ میں بھگوان ملے!
- رُوپ بدل کر تو شیطان ہی آتا جاتا ہے۔
- تو کیا بابا کی وہ میٹھی میٹھی باتیں کسی فلسفی کے کہے اقوالِ زرّیں نہیں تھے۔
- جو بھی کہہ گیا۔ ٹھیک ہی تو ہے۔
- پھر کوئی مستانہ جوگی ہوگا۔ یا پھر دیوانہ!
- دیوانہ تو دیوانوں کی ہی باتیں کرے گا۔

ہاں مگر! میری جیب میں کاغذ؟ خط ہے۔ بابا کا۔ کمال ہے جب میں نے اس کے بال کاٹے تھے تب وہ جاگ رہا تھا۔ ایسا ہی لکھا ہے بابا نے۔ اور سنو۔ رات بھر وہ جاگ رہا تھا اور ہماری باتیں سن رہا تھا۔ میں ہنس رہا ہوں۔ تم بھی ہنس پڑو گے یہ جان کر، اُس نے ہم چاروں کو بلایا ہے۔ اُسی چنار کے درخت کے نیچے۔ جہاں ہم اپنے گھروں سے نکل کر محلے کی گلی کوچوں، سڑکوں کو رات کی تاریکیوں سے پار کر کے علی الصباح پہنچے تھے۔ یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔ ایک بار پھر کل جیسی کیفیت طاری ہو گئی تو چاروں کا جسم اکڑنے لگا۔ تب نائی نے خاموشی توڑ کر

کہا۔

- خط ابھی پورا نہیں ہوا۔ لکھا ہے۔ موت کی حقیقت تسلیم کرلو تو یہ جان لو کہ موت کا دن معین ہے۔ مارنے والا دنیا بنانے والا ہے۔ کون کیسے مرے گا یہ بھی طے ہے۔ جلاّد کا کیا قصور۔ اس نے جیلر کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ جیلر جج کا حکم بجالایا تھا۔ جتنی دیر زندہ رہو، کشمکشِ زندگی جاری رکھو۔ تنگ دائرے میں رہو گے تو سکڑتے ہوئے محیط کو نزدیک آتے دیکھ کر زندہ ہوتے ہوئے بھی مر جاؤ گے۔ بڑے دائرے میں رہنا چاہو تو اپنے گھر لوٹ کر آؤ۔

یہ سن کر چاروں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر بلندی سے پہلے زمین کو دیکھا اور پھر نظریں اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ دور بہت دُور جب کچھ دیر کے لیے ان کی نگاہیں اُفق پر جمی رہیں تب چاروں کو احساس ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے دائرے میں داخل ہونے جا رہے ہیں جس کی محیط آسمان ہے!

واپس لوٹتے ہوئے ایک بلند جگہ سے ان کو وہ چنار کا پیڑ نظر آیا جہاں وہ اتفاقاً بابا سے ملے تھے۔ ان کو بابا تو نظر نہیں آیا مگر ایک جھیل نظر آئی۔ جھیل میں کنول کے پھول تھے اور چھوٹی سی لڑکی، ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا چپو لیے ایک بڑی کشتی کو آہستہ آہستہ آگے لیے جا رہی تھی۔

جھیل کے چاروں طرف ہریالی تھی اور اُفق سے چڑھ رہا آفتاب نظر آ رہا تھا، جو اُن کے دائرے کے محیط کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔

○○

آزمائش

یہ ایک آزمائش ہے یا ایک سزا؟ اور آزمائش کی آڑ میں بھگوان اپنے ہی نیک بندوں کو طرح طرح کی تکلیفیں بلکہ اذیتیں کیوں دیتا رہتا ہے؟

کہتے ہیں جن کو اس جنم میں آزمانے کی خاطر سزا دیتا ہے ان کو بطور جزا پرلوک کا سکھ دینے کا بھروسہ دیتا ہے۔

بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ مہارشی وِشوامتر نے ایک نیک راجا ہریش چندر سے آزمانے کے لیے راج پاٹھ چھین لیا اور ظلمات کی انتہا تب ہوئی تھی جب ہریش چندر کی بیوی تارامتی ان دونوں کے اکلوتے بیٹے رُوہت کی لاش جلانے کے لیے شمشان میں لے گئی تھی تب مجبور شوہر نے لاچار بیوی سے جلانے کے لیے ایک سکّہ مانگا تھا جو نہ ملنے کی وجہ سے بیٹے کی لاش زمین پر پڑی رہی تھی اور اُس کے والدین ایک اذیت ناک کرب سے گزر رہے تھے۔ اگر آزمائشیں ہوں تو ——

نندو اپنے آپ کو سمجھا تا رہا مگر دُکھ درد کو کیا سمجھا جا سکتا ہے! ہریش چندر کی کہانی تو ایک سنی سنائی اساطیری کتھا ہے مگر جو بھی نندو پر گزری ہے وہ تو ایک سچّی مگر دردناک کہانی ہے! وہ پوجا پاٹھی برہمن تو ہے مگر اس کا تعلق برہمنوں کے اُس طبقے سے ہے جو دسویں دن کے شرادھ پر مُردے کے کپڑے، چھتری، بستر، برتن وغیرہ لے کر آتماؤں کی شانتی کے لیے دُعا کرتے ہیں۔ یہ وہ برہمن ہوتے ہیں جو نہ شادی بیاہ کے لیے لگن کرواتے ہیں اور نہ ہَون وغیرہ کرواتے ہیں بلکہ یہ پنڈ دان یا شرادھ بھی نہیں کرتے ہیں بس دسویں دن کے ندی یا دریا پر ہو رہے شرادھ پر بلائے جاتے ہیں! پھر مرے ہوئے انسان کے کرم کرنے والے کے سامنے بٹھا کر اُن کو یہ بتایا جاتا ہے کہ جو مر گیا اس کی روح اس شخص میں ہے اس لیے اس کو عزت دے کر کھلاؤ پلاؤ اور اُس کی اپنی وہ چیزیں یا وہ ذاتی سامان جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر اپنے ابدی سفر پر چل پڑا ہے اُس کے حوالے کر دو تا کہ وہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جائے۔ اور وہ پھر چلا جاتا ہے۔ آج وہ بھی یہی کام کرنے گھاٹ پر آ کر

چل پڑا تھا۔ مگر ریتی رواج کے مطابق نندو چاریہ کو نہ تو کہیں رُکنا تھا اور نہ پیچھے مُڑ کر شرادھ کرنے والوں کو دیکھنا تھا مگر نندو گھاٹ سے چند قدموں کی دوری پر رُک بھی گیا اور پلٹ کر اُس لڑکے کو دیکھنے لگا جو اپنے باپ کا شرادھ کروار ہا ہے! ظاہر ہے گھاٹ پر سنسنی پھیل گئی کیونکہ ایسا پہلی بار ہوا ہے جب علاقے کے یہ کام کرنے والے واحد شخص نندو چاریہ جی سے ایسی غلطی ہوئی تھی اس لیے بزرگ لوگ وَسوسوں کے دلدل میں دھنس گئے تھے مگر کسی کی ہمت، نندو سے رُک جانے کی وجہ پوچھنے کی نہیں ہو رہی تھی! بلکہ کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی گھاٹ پر جمع لوگوں کو وہم کی اندھی غار سے نکالنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا! اس لیے وہی تماشہ تھے اور وہی تماشائی! مگر سبھی کی نظریں نندو چاریہ جی پر یوں جمی ہوئی تھیں گویا واقعی مرحوم دیپ کمار شرما کی روح کچھ مانگ رہی تھی۔ وِداع ہونے سے پہلے نندو جب اپنے لمبے سفید بالوں اور لمبی سفید داڑھی میں آیا تھا تب وہ ایک مہاتما جیسا نظر آیا تھا اور اب اُس کے موٹے شیشوں والی عینک میں اُس کی آنکھیں سبھی کو ڈراؤنی نظر آرہی تھیں! گویا انسان ایک بھینسا نظر آرہا تھا! نندو کا باپ بھی یہی کام کیا کرتا تھا۔ یعنی یہی اُن کا خاندانی پیشہ ہے۔ شہر کے حدود کے باہر ایک چھوٹا سا گاؤں ہوا کرتا تھا کبھی، جہاں ہر ذات کے لوگ رہتے تھے بلکہ اب بھی رہتے ہیں اور سبھی نندو کو تب بھی اور اب بھی جانتے ہیں۔ اُن میں چند لوگ پاس کے گاؤں کے پرائمری اسکول میں اُس کے جماعتی بھی ہوا کرتے تھے۔ اُن میں بیشتر لوگ تب بہت غریب تھے بلکہ اب بھی غریب ہیں۔ ان کے کپڑے پھٹے پُرانے اور گاؤں کے درزی کے بنائے ہوئے ہوا کرتے تھے مگر نندلال شرما کے کپڑے سائز میں بڑے تو ہوا کرتے تھے مگر عمدہ ہوا کرتے تھے۔ رنگ برنگے ہوا کرتے تھے! اور یوں نظر آیا کرتے تھے جیسے جھاڑیوں میں کھلا ایک گلاب کا پھول —!

برسات کے موسم میں اسکول میں وہ ایک ہی لڑکا تھا جس کے سر پر چھتری ہوا کرتی تھی یا پھر بڑے سائز کے رین کوٹ سے جڑی ٹوپی! تب وہ نندلال شرما تھا جو ایک ذہین لڑکا تھا۔ اُس سے رشک کرنے والے بھی تھے اور حسد کرنے والے بھی۔ ایک رشک کرنے والے کے باپ نے اُس کو یہ بتا دیا تھا کہ نندلال برہمن ہے اس لیے ایک ہریجن سے آگے نہیں جا سکے گا مگر حسد میں جل رہے بچوں کے والدین نے ایک بھیانک آگ کو یہ کہہ کر بجھا دیا کہ نندلال چندو چاریہ جی کا بیٹا ہے اور اُس کے کپڑے مُردوں کے کپڑے ہیں۔

یہ جان کر بھی مل کر اُس کو چڑاتے رہتے تھے۔ مُردوں کے کپڑے پہن کر اسکول کا سب سے گورا لڑکا رنگ دار کپڑوں میں ایک بھوت ہے! وہ جو کپڑے پہنا کرتا ہے وہ واقعی مُردوں کے تھے، یہ وہ جان گیا تو اُس کو اپنے کپڑوں سے نفرت ہونے لگی تھی بلکہ وہ اپنے آپ سے بھی ڈرنے لگا اور پھر جب اُس کو یہ پتہ چلا کہ یہ اُن کا خاندانی پیشہ ہے تب وہ تذبذب کا شکار ہو کر اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا اور نتیجتاً جب اگلی بار اُس کا باپ معمول کی طرح اپنے ساتھ کپڑے، لحاف، ایک قیمتی کمبل اور ایک کوٹ لے آیا تو باپ بیٹے میں زبردست جھگڑا ہوا، باپ فخر سے اپنے کام کی تعریفیں کر کے نندو کو بار بار سمجھاتا رہا مگر بیٹا ہر بار اپنی ضد پر اڑ کر ایک دن گھر سے بھاگ ہی گیا اور شہر کی ایک نئی کالونی میں دودھ، دہی اور پنیر بیچنے والے کی دُکان میں کام کرنے لگا۔ بطور ایک نوکر اُس نے اپنے مالک کا دل جیت لیا۔ تب نندلال شرما مشکلاً چودہ سال کا تھا۔ نہا دھو کر، پوجا پاٹھ کر کے جب ایک سفید کرتے پاجامے میں وہ اپنے مالک کی جگہ دُکان پر گاہکوں کی نظروں کے سامنے آیا تو دُکان چمک جاتی تھی۔ ایک تو اس لیے کہ دُکان کا مالک کبھی کوڑھ کا مریض تھا۔ حالانکہ اب وہ مکمل طور پر ٹھیک ہو چکا تھا مگر ہاتھوں پر چند بدنما داغ نظر آیا کرتے تھے۔ داغ دار ہاتھوں سے وہ کام تو کیا کرتا تھا لیکن چند نفسیاتی وجوہات کے سبب گاہک قریب آ کر اپنی اُبکائی روک کر دُور ہو جایا کرتے تھے۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ نندلال بہت سُریلا تھا اور شکل صورت سے بہت خوبصورت تھا، اس لیے گاہک نندو کو دینو مہاجن یعنی حلوائی کا بیٹا سمجھ کر اس سے خوب گھل مل جایا کرتے تھے۔ کالونی نئی تھی، آدھی بن چکی تھی آدھی بن رہی تھی۔ ساتھ ساتھ رہنے والے بھی اجنبیوں کی طرح پہلے پہل ملا کرتے تھے مگر بعد میں ماضی کو کریدے بغیر وہ نیک پڑوسی بن جایا کرتے تھے۔ اس لیے جان پہچان بھی نئی ہوا کرتی تھی۔ ذات پات کے بارے میں کوئی تناؤ نہیں ہوا کرتا تھا۔ کون ہندو، کون مسلمان، کون برہمن، کون ہریجن، ان موضوعات پر امیر لوگ ویسے بھی بحث نہیں کرتے ہیں، ان کے لیے رُتبہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے نا؟ اس کا پورا پورا فائدہ لے کر نندو پھر نندلال بن گیا تھا۔ نندلال شرما ولد چندن داس شرما۔ دُکاندار نے نندلال کو برج کے نندلال کرشن کنہیا کی طرح چمتکاری پایا تو اس نے اپنے دونوں بیٹوں کی پڑھائی جاری رکھوا کر نندلال کو ہی مٹھائیاں بنانے کا ہنر سکھا دیا۔ اور چند برسوں میں ان کی دُکان مٹھائی محل کے نام سے ایک مشہور دُکان بن گئی۔

دُکاندار ایک اچھا آدمی تھا اس لیے اس نے نندلال کو گھر دیا اور اس کی شادی ایک گاؤں کی گونگی بہری مگر بے حد خوبصورت لڑکی سے کروادی۔ دراصل یہ نندلال کی ہی پسند تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی بیوی اُس سے اس کے والدین کے بارے میں کریدتی رہے، کیونکہ نندو نے اپنے محسن دُکاندار کو بتایا تھا کہ وہ دُور ایک ایسے پہاڑی علاقے سے آیا ہے جہاں جانے کے لیے دو دن بس میں اور پھر تین دن کا پیدل سفر طے کرنا پڑتا ہے! یہ پہلا اور آخری جھوٹ اس نے اس لیے بولا تھا تا کہ نندو چاریہ جی اس کا تعاقب نہ کرتا رہے۔

دُکاندار چل بسا تو اس کے بیٹوں نے نندلال کے ہی بل بوتے پر سرکاری افسری ٹھکرا کر دُکانداری کو ہی ترجیح دی۔ ان برسوں میں وہ اپنے گھر جان بوجھ کر اس لیے نہیں گیا کہ اس کو سب کچھ چھوڑ کر اپنا خاندانی پیشہ نہ اپنانا پڑے! اُس کے خاندانی پیشے کے بارے میں صرف ایک گوجر کو معلوم تھا جو اُن کی دُکان پر دودھ دینے آیا کرتا تھا لیکن نندلال کے کہنے پر وہ خاموش تھا۔ نندو کا پڑوسی اور اس کا واحد یار! گوجر نے ہی تو ایک دن اس کو یہ بتایا تھا کہ اس کے والدین ہری دوار گئے تھے اور وہاں ہی ایک حادثے کا شکار ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ اس دردناک سانحہ پر بھی وہ اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ مگر اُس روز وہ اتنا رویا تھا کہ اس کی گونگی بہری بیوی بھی سمجھ گئی تھی کہ اس کے ساس سسر مر گئے ہیں۔ اس لیے وہ بھی اپنے دودھ پیتے بچّے کو ساتھ لے کر اپنے پتّی کے ساتھ ہری دوار گئی تھی۔ اور ایک اچھی سنسکاری بہو کی طرح اپنے پتی کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر ساس سسر کا شرادھ کروایا تھا۔ کیونکہ ان کے پاس والدین کے کپڑے تھے نہیں اس لیے انھوں نے اپنے سارے کپڑے بھکاریوں کو دے دیے تھے بلکہ نئے کپڑے بھی دان کیے تھے! اُس کے بعد نندلال خوش تھا کہ اس کو کسی بھی وجہ سے اپنے گاؤں لوٹ کر نہیں جانا پڑے گا اور اپنے باپ کی جگہ وہ کام نہیں کرنا پڑے گا جس سے نفرت کرنے کی وجہ سے اس کو گھر سے بھاگ جانا پڑا تھا مگر رنج اس بات کا تھا کہ وہ اپنے والدین کو اُگنی دان نہیں دے سکا تھا! وقت گزرتا گیا، ان کا مٹھائی محل اتنا مشہور ہو گیا تھا کہ شہر کے لوگ دُور دُور سے مٹھائیاں خریدنے آیا کرتے تھے۔ نندلال تجربے کی بنا پر عام مٹھائیاں بھی خاص طریقے سے بنا کر اتنا مشہور ہو گیا تھا کہ جن مٹھائی بنانے والوں کی بزنس متاثر ہو گئی تھی وہ اس کو لالچ دے کر اپنے پاس کھینچ کر لانے کی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن نندلال اپنے محسن کی آتما کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا تھا اس لیے وہ ان سب کو مایوس کر کے ان کے

انتقامی جذبے کو اُکساتا رہا۔ وہ تاک میں بیٹھ کر کسی بھی طریقے سے اُسے مٹھائی محل سے نکالنے کے چکر میں تھے۔ نندو کے خلوص کو مالکوں نے کبھی نظر انداز نہیں کیا تھا بلکہ اس کی خدمات کو دیکھ کر نندلال کے بیٹے کو ڈونیشن دے کر انجینئرنگ کی سیٹ دلا کر اس کی ٹریننگ کا خرچہ بھی اپنے ذمّے لیا تھا۔

وہ دن نندلال کے لیے بہت ہی اہم تھا جب اُس کے انجینئر بیٹے کو سرکاری نوکری دلانے والے نے ہی اس کو اپنا داماد بنالیا تھا۔ جب اُس کے پوتے کے جنم دن پر شہر کے تمام عزّت دار لوگ اس کو آشیرواد دینے آئے تھے تب اُس دن اس کو یقین ہو گیا تھا کہ مرحوم چندو چاریہ جی کے بیٹے نندو چاریہ جی کو اب لوگ شردھ کمار شرما کے دادا کو پنڈت نندلال شرما کے نام سے یاد کرتے رہیں گے۔ یعنی اپنا گاؤں چھوڑتے وقت اُس نے جو خواب دیکھا تھا اُس کی تعبیر نظر آئی تھی۔ جنم کی بجائے کرم پر انسان کی شناخت ہو، یہی تو وہ چاہتا تھا۔ اس کو اس بات پر بے حد خوشی تھی کہ اُس کے ساتھ کام کرنے والے برہمن، کھتری، مہاجن، ہریجن بلکہ مسلمان بھی کاریگر کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اور وہ سب ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے لیکن اپنے مطلب کے لیے ذات پات اور ماضی کے گندے انڈوں کو اُچھالنے والے، نندلال کو ننگا کر کے انتقام لینے والے کہاں اُس کا یہ نیک خیال وثمر آفریں عمل قبول کرتے؟ اس لیے وہ نندو کے پیچھے ہی پڑ گئے تھے ان کے مٹھائی محل کی مٹھائیاں جب شہر سے درآمد ہونے لگی تھیں تب شہر کے تمام مٹھائیاں بنانے والے ایک ہو گئے اور نندلال کے ماضی کو کُریدنے میں کامیاب ہو گئے تھے پھر میدانِ جنگ میں ایک نئی مہابھارت شروع کرنے کے لیے کود پڑے تھے۔ مٹھائی محل پر کوئی بھی اثر نہیں پڑا تھا مگر نندلال کو اچانک نندو چاریہ جی سے ڈر لگنے لگا تھا، خاص طور پر یہ سوچ کر کہ اگر اس کا بیٹا جان گیا کہ اس کا دادا چندو چاریہ جی تھا تو کیا ہوگا؟ —! اور اُس کے دشمنوں نے نندو کو نندلال کے سامنے کھڑا کر دیا تھا اس سے پہلے کہ پھر حملہ ہوتا اور مٹھائی محل میں شگاف پڑ جاتے وہ اپنے بہو بیٹے سے ملا تھا۔ ایک فیصلہ کر کے جو اُس کے لیے بُرا تو تھا مگر اس کے بیٹے اور پوتے کے لیے مفید تھا۔ خوش قسمتی سے اس کے بیٹے کی پوسٹنگ ایک دُور دراز پہاڑی علاقے میں تھی اور وہ اپنے شہر میں ہو رہی مٹھائی کے تاجروں کی سیاست سے بے خبر تھا۔ حالانکہ بیٹا چاہتا تھا کہ باپ حلوائی کا کام چھوڑ کر اُس کے ساتھ رہے مگر باپ مذاق میں بات ٹال دیا کرتا تھا مگر اس بار ایسا نہیں ہوا۔ نندلال نے اپنے بیٹے پر ایک ایسی جنگ تھوپ دی تھی کہ اُس نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تھا اور نندلال یہی تو چاہتا

تھا۔ نندلال یوں تو اس کو ٹی.وی پر کھانا بنانے والوں کی مثال دے کر کہا کرتا تھا کہ میں تو حلوائی نہیں ہوں چیف ہوں مگر اس بار اس نے بیٹے کو اُکسانے کے لیے کہا تھا کہ وہ نوکری چھوڑ کر ایک نیا مٹھائی محل بنا دے تو باپ کی ایک ہی خواہش حسرت میں نہیں بدل جائے گی۔ وہ اپنی بیوی کو ساتھ کے گھر چھوڑ کر، سارے رشتے ناطے بندھن توڑ کر پہاڑوں میں جا کر رہنے کی اطلاع دے گیا تھا۔ اور چلا گیا تھا۔

یہ عمل صرف اپنے آپ کو چھپانے کے لیے کیا گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نندو چاریہ جی اپنے گاؤں میں رہ کر بھی اپنے بیٹے اور پوتے کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ یعنی گلشن نظر آئے یا نہ آئے، ہوائیں تو مہک لے آئیں گی نا! یہ سوچ کر وہ اپنے شکستہ دل کو تسلیاں دیا کرتا تھا۔ مٹھائی محل کے مالکوں کو جب یہ جانکاری ملی کہ ان کے رقیبوں نے نندو چاریہ جی کے خوف سے نندلال کو رُسوا کر کے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا ہے تب وہ شاید اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے مگر یہ جان کر کہ نندلال کے رہنے یا جانے سے مٹھائی محل کی مضبوط بنیاد ہل نہیں سکتی تو انھوں نے ایک باپ کی طرح پیار کرنے والے ایماندار ہنر مند کاریگر کی کہانی ختم کر کے ورق ہی اُلٹ دیا تھا؟ نندو سے نفرت کرنے والا نندلال شرما جب اپنے گاؤں کے مکان میں داخل ہوا تب اُس نے ایک آواز سن لی تھی۔ گویا کوئی اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

''اچھا ہوا جو گھر میں پھر دیا جل گیا! وہ دیا جو بھڑک رہی آتماؤں کو روشنی دکھا کر اشانتی کی تاریکیوں سے نکال کر سکون کے محفوظ دائرے میں لے جاتا ہے۔''

نندو نے جب جھانک کر دیکھا تو اُسی گوجر کو دیکھا جو یہ جانتا تھا کہ مٹھائی محل کا نندلال شرما ہی اُس کے بچپن کا دوست نندو چاریہ جی ہے۔ یہ گوجر نورالدین تب بھی دودھ والا تھا اور اب بھی دودھ والا ہے۔ وہ تب بھی نندو کا یار تھا اور اب بھی ایک دوست ہے۔ ان کے ساتھ پڑھنے والے گاؤں چھوڑ کر شہر میں رہتے ہیں کوئی سرکار ملازم تو کوئی دُکاندار، سپاہی یا ٹھیکیدار۔ اس سے پہلے کہ نندو اُس سے کچھ پوچھتا گوجر نے خود ہی اس کے سوالات کے جوابات دے دیے تھے۔

''نندو تو سوچ رہا ہوگا کہ میں مسلمان ہوتے ہوئے یہ کیسی باتیں کر رہا ہوں! ارے میرے یار میں اپنے عقیدوں پر ہی یقین رکھتا ہوں! پانچ وقت سجدہ کرتا ہوں! نہ میں ہندو بن گیا ہوں اور نہ تم مسلمان بن جانا۔ میں تو اُس باپ کی بات دُہرا رہا ہوں جس کا بیٹا ایک ہوائی جہاز کے حادثے

میں فوت ہوگیا تھا اور وہ خود تمھارے باپ کو اُس کے دسویں دن کے شرادھ پر، دان لینے کی التجا لے کر آیا تھا کیونکہ اُس شام بھی اس گھر میں دِیا جل رہا تھا۔ اور وہ میں نے جلایا تھا۔

معلوم ہے کیوں؟ وہ یوں کہ تمھارا باپ ہری دوار جانے سے پہلے گھر کی چابیاں مجھے دے گیا تھا! مندر کی چابیاں بھی! وہ لوٹ کر نہیں آیا تو گاؤں والوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ مردوں کے کپڑے لینے والا سانپ بن اس ویران گھر میں رہتا ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ گھر کو آباد رکھنے کے لیے یہاں ہفتے میں ایک رات تو گزار کر دِیا جلایا کروں گا۔ میں رات بھر دِیا جلا کر تمھارے باپ کی طرح بت پرستی تو نہیں کیا کرتا تھا مگر عبادت ضرور کیا کرتا تھا! آج بھی دِیا جلانے آیا تو تمھارا اچھل رہا سایہ دیکھ کر پہلی بار چونک پڑا۔ یہ کیا۔ چندو چاریہ جی گھر میں آیا ہے؟ نندو! ان لمبے بالوں اور لمبی داڑھی میں تو بالکل اپنے باپ جیسا لگ رہا ہے! جب داڑھی اور بال بالکل سفید ہو جائیں گے اور یہ پاجامہ اُتار کر دھوتی پہننا شروع کرے گا تو باپ جیسا نہیں چندو چاریہ جی ہی نظر آئے گا۔ اللہ کی قسم لوگ سوچیں گے کہ ان کے سامنے نندو چاریہ جی نہیں بلکہ چندو چاریہ جی کھڑا ہے۔ اور تمھیں دان لینا پڑے گا۔''

گوجر کو گلے لگا کر اس شام نندو آخری بار رویا تھا۔ اور پھر اگلی صبح وہ نندلال کو اپنے ذہن سے نکال دینے میں کامیاب تو ہوگیا تھا مگر وہ اپنی شناخت کو پردے میں رکھنے کی خاطر کہیں نہیں جایا کرتا تھا مگر اپنی جگہ ایک دُور کے رشتے دار کو گھاٹ پر بھیجا کرتا تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ چندو چاریہ جی کا پوتا ہے۔ دان میں جو بھی آیا کرتا تھا وہ اس کا رشتے دار ہی لے جایا کرتا تھا۔ پھر دس سال بعد جب اس کی بیوی کو سانپ نے کاٹ کر اپنے ساس سسر کے پاس بھیج دیا تو وہ رویا نہیں تھا بلکہ خود ہی اس کا انتم سنسکار کیا تھا اور شرادھ بھی کیے تھے۔ بیوی کے مرجانے کے بعد اس نے اپنی ساری جائیداد بیچ ڈالی تھی اور ایک دن اپنے بیٹے کے گھر تب گیا تھا جب اس کا بیٹا شہر سے باہر تھا اور پوتا کالج گیا ہوا تھا۔

بیٹا ٹور پر جا رہا ہے یہ وہ تب جان گیا تھا جب وہ ایک دن پہلے ایک وفد کے ساتھ افسرِ اعلیٰ سے پینے کے پانی کو دستیاب کرنے کے لیے گیا تھا۔ بیٹے نے باپ کو نہیں پہچانا تھا۔ حالانکہ دونوں آمنے سامنے تھے۔ باپ کا دل شاد بھی تھا اور ناشاد بھی! اُس روز اُس کی بہو نے اُس کو پہچان لیا تھا وہ بھی شکل وصورت کی بجائے نندو کی سُریلی آواز سے! نندو وہاں تھوڑی دیر کے لیے رُکا تھا مگر

جانے سے پہلے ایک بیگ میں زیورات اور نقد چار لاکھ روپے ڈال کر اُس میں ایک خط رکھ دیا تھا۔ اور خط کی مختصر تحریر میں یہ لکھا تھا کہ میرے پوتے کو ٹریننگ پر بھیجنے کے لیے اگر ڈونیشن کی ضرورت پڑ جائے تو یہ زیور بھی بیچ دینا۔ تمھاری مرحومہ والدہ کے ہیں اور روپے میری ساری جائیداد کی قیمت ہے۔ تمھارے بزرگوں کی زمین پر اب ایک کالونی بن رہی ہے نا! مگر کہاں۔ یہ میں نہیں بتا سکتا ہوں۔" بیگ کونے میں رکھ کر وہ اچانک غائب ہو گیا تھا۔

دوسرے دن وہ اپنے گھر میں سمادھی لے کر بیٹھ گیا تھا۔ رشتے دار کو اپنے گھر بھیج کر! ایک سنیاسی کی طرح پران تیاگ دینے کی خاطر۔ مگر ایک صدا نے اس کو چونکا دیا تھا اور یوں اس کی دس دن کی تپسیا بھنگ ہو گئی تھی۔

"نندو! ایک شرادھ میں جانا ہے۔ تمھیں لینے کے لیے کار آئی ہے۔ بے چاروں پر قہر ٹوٹ پڑا ہے۔ تمھارا رشتے دار ہے نہیں۔ تم کو ہی جانا پڑے گا۔ دوست! عقیدوں کی باتیں ہیں اب تمھارے دان لینے سے روح کو سکون ملتا ہے یا نہیں یہ تم جانتے ہو۔ اب وہ رو رو کر التجا کر رہے ہیں تو اس بار جاؤ۔ انسان کے عقیدوں کی خاطر۔"

نندو اپنی سمادھی توڑنا نہیں چاہتا تھا مگر گوجر کے اصرار پر وہ تب چل پڑا جب اس نے یہ بتایا کہ دس دن پہلے ہوئی موت ایک حادثے کی وجہ سے ہوئی ہے اور اگر وہ دان لینے کے لیے نہیں جائے گا تو مرحوم کی آتما بھٹکتی رہے گی! خاص طور پر تب جب گوجر نے کہا کہ اگر تمھارے عقیدوں کے مطابق یہ سچ ہے کہ بھٹکتی ہوئی آتما ایک بھوت یا پریت بن جاتی ہے تو تمھیں جانا ہی ہوگا۔ نندو کا دل تیز رفتار سے دھڑکنے لگا اور وہ کار میں بیٹھ گیا۔ اور اپنی نرالی کیفیت بھانپ کر خود بھی حیران و پریشان تھا۔ گھاٹ پر چند جانے پہچانے چہرے دیکھ کر وہ چونک تو پڑا تھا مگر کوئی اس کو پہچان نہ لے اس نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے اور منہ چھپا لیا تھا۔ پھر وہ وقت آیا جب وہ اپنے پوتے کے سامنے بیٹھ گیا اور شرادھ کرانے والے پنڈت نے اُس کے پوتے سے کہا۔

"تمھارے سامنے تمھارے باپ کی آتما ہے جو اس جسم میں بیٹھی ہے ان کی سیوا کرو۔ کھلاؤ پلاؤ اور ان کی چیزیں ان کو دے کر وداع کرو!"

سب کچھ رسم کی ضرورتوں کے مطابق ہوا۔ اچانک جب ایک جانا پہچانا بیگ نندو کے کندھے پر رکھا گیا تو پوتے نے کہا کہ یہ "بیگ میرے دادا میرے پاپا کو دینے کے لیے دے گئے

تھے۔لیکن پاپا لوٹ کر آئے نہیں'' یہ آخری جملہ نندو کے کانوں میں گونجتا رہا اور اُس کے قدم رُک گئے تھے اور ایک دادا نے اپنے پوتے کو دیکھنے کے لیے مڑ کر دیکھا تھا۔

شرادھ کروانے والے پنڈت نے جب نندو کو رسم یا ریت کی اہمیت کا احساس دلایا تب وہ یوں زمین پر گر گیا گویا ایک چنار کا درخت کھوکھلا ہو کر آری کے دانتوں سے کٹ کر زمین پر گر پڑا تھا۔ جو بھی ہو چکا تھا اور جو بھی ہو رہا تھا، ایسا پہلے نہ کسی نے سنا تھا اور نہ دیکھا تھا۔ ایک رنجیدہ ماحول ایک سنسنی خیز ماحول بن گیا تھا۔ گوجر نے نندو سے گر جانے کی وجہ جاننا چاہی تو نندو نے اپنی مخصوص آواز میں جواب دیا کہ اب زندگی کا بوجھ اٹھایا نہ جائے گا! اور ایک آزمائش؟ کیوں! کیوں!! نندو دریا کے کنارے پڑے پتھروں پر گر کر چل بسا۔

یہ دردناک منظر دیکھنے والے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ جو ہوا وہ اچھا ہے یا بُرا؟ شبھ ہے یا اَشبھ؟ شاستریوں سے پوچھنا پڑے گا! اور اگر مرنے والے یا اُس کے گھر والوں کے لیے اس شخص کا اس طرح مر جانا بُرا ہے تو کیا ایک اور شرادھ کرنا پڑے گا؟ کسی نے غصّے سے کہا۔ جانے کس آزمائش کی بات کر رہا تھا۔ بد بخت نے ہمیں ایک آزمائش کی طرف دھکیل دیا ہے!

OO

منزل

بھیم، ارجن، نکل اور سہدیو کو اجنبی کی باتیں سن کر اس بات کا یقین ہوگیا کہ ان کا بڑا بھائی ہونے کا دعویٰ کرنے والا ہی یدھشٹر ہے جبکہ وہ جو چپ چاپ بیٹھا معصوم چہرے والا ہے وہ ان کے دشمن کا ایک خطرناک ساتھی ہے بلکہ وہی دہشت گرد ہے جو ان کے بڑے بھائی اور اجنبی کو اغوا کرکے، ان کو گمراہ کرکے، ان کو ان کی منزل سے دُور بہت دُور لے جانے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔

وہ یہ جان چکے تھے کہ ان کے ساتھ ایک لمبا سفر طے کرنے والا یدھشٹر ان کے ساتھ ہے مگر وہ اس کو اس لیے نہیں پہچان پائے تھے کیونکہ اجنبی نے بہت ہی ہوشیاری سے، بقول اس کے، ایک شاطر کے چہرے سے نقاب اُتار کر اس کو اپنی عقلمندی سے اس قابل بھی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اپنا اصلی چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپالیتا۔ پانچوں بھائیوں نے معمول کی طرح اپنا سفر شروع کیا ہوتا مگر ایک جانی پہچانی آواز سے پانچ بھائیوں میں چار بھائیوں کے قدم رُک گئے تھے۔ ''بھٹکے ہوئے مسافر منزل کو ڈھونڈنے چلے ہیں۔'' یہ آواز کوئی آکاش وانی نہیں تھی بلکہ اس بہروپی کی آواز تھی جو اجنبی کی باتیں سنتے سنتے اچانک بول پڑا تھا۔

اس کی آواز میں لرزش تھی اور درد۔ تڑپ تڑپ کر ایک ایک لفظ منہ سے یوں نکال رہا تھا جیسے وہ سنگ سار ہوکر اپنے اوپر پڑے پتھروں کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ اس کی یہ حالت بھیم، ارجن، نکل اور سہدیو نے کی ہے۔ اس کا جسم اور چہرہ لہولہان کردیا گیا ہے۔ کیونکہ کل شام بھی چار بھائی سوگئے تھے اور ان کا بڑا بھائی آس پاس، معمول کی طرح، سحر تک پہرہ دینے کے لیے چلا گیا تھا۔ مگر اس بار یدھشٹر کے ساتھ ایک اجنبی بھی تھا جس کو پانچوں بھائیوں نے اپنی پناہ میں لیا تھا! معمول کی طرح وہ آج سحر کے وقت ان کو جگا کر پہرہ دینے کی ہدایات دے کر خود سونے نہیں آیا تھا۔

دن چڑھ آیا تب جب چاروں بھائی جاگ پڑے تھے، وہ یہ سوچ کر کہ یدھشٹر عادتاً اجنبی کو رات بھر جگ بیتی یا پھر آپ بیتی سناتے اپنی سدھ بدھ کھوکر تصورات کی دنیا میں کھوگیا ہوگا وہ بھی اپنے

خوابوں کی دنیا میں کھو گئے تھے، یہ بھول کر کہ ان کے رُکے ہوئے قدم ان کے دشمن کو ان کے قریب لاسکتے ہیں جبکہ ان کے آگے بڑھتے ہوئے قدم ان کو ان کی منزل کے قریب لے جاسکتے ہیں۔

اچانک جب سفر جاری رکھنے کے عزم نے اپنی ایک جنبش سے حقیقی دنیا میں لوٹا دیا تب وہ یدھشٹر اور اجنبی کو کھنڈر کے اس حصے میں ڈھونڈنے نکل پڑے تھے جہاں اُن کا رہبر نگہبانی کرنے کے ارادے سے گیا تھا۔ وہاں ایک کمبل سے اپنا جسم و چہرہ ڈھانپ کر ایک آدمی کو لیٹے ہوئے دیکھ کر وہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اجنبی بھاگ گیا ہوگا لیکن جب بھیم نے چہرے سے چادر اٹھائی تھی تو ایک لمبے بالوں اور لمبی داڑھی والے یدھشٹر کی بجائے ایک بغیر مونچھ بغیر بال والے معصوم چہرے کو دیکھ کر یہ فوراً جان گئے تھے کہ ایک سنگ چور یدھشٹر اور اجنبی کو بھگا کر ویسے ہی ان کی پناہ گاہ میں گھس گیا جیسے ایک سانپ چوہوں کو کھا کر یا بھگا کر ان کے بل پر قابض ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ چاروں بھائی سانپ کو کچلنے کی خاطر اس پر ٹوٹ پڑے۔

وہ کچھ بولنا چاہتا تھا مگر گھونسوں کی بوچھار نے اس کے ہونٹوں کو اس کے ہی بہہ رہے لہو سے بند کر دیا تھا! یدھشٹر ان کا سگا بھائی نہیں ہے اور نہ وہ چاروں پانڈو ایک دوسرے کا نام جانتے ہیں۔ ہاں وہ پانچوں اکھڑے اُجڑے لوگ ہیں جن کو کشمکشِ حیات نے ملا دیا ہے۔

یدھشٹر کو کوروں نے اپنے شکنی ماما کی مدد سے جوئے میں ہرا کر راج پاٹھ چھین کر اپنے چاروں بھائیوں کے سمیت جلاوطن نہیں کیا ہے بلکہ ایک منصوبے کے تحت گھر سے بے گھر کر دیا گیا ہے! پانچوں اکھڑے اُجڑے بدبخت ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کو بہت جلدی سمجھ کر ہم سفر بن گئے تھے۔ خاص وجہ تو یہ تھی کہ ان کو اپنا گھر، اپنا محلہ، اپنا شہر بلکہ اپنی حسین وادی اس لیے چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا تھا کیونکہ وہ دراندازوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھ کر ان سے نفرت کرتے تھے بلکہ ان کی حرکتوں کو دہشت گردی سمجھ کو ان کی مخالفت کرتے تھے۔ گویا وہ دُور سے آئی ہوئی ہواؤں سے اپنی شاخوں سے کٹے ہوئے وہ سرسبز پتے تھے جو اُڑتے اُڑتے ایک ہی جگہ گر پڑے تھے۔ شروع شروع میں وہ ایک دوسرے کے پاس پاس رہ کر بھی دُور دُور بلکہ کھنچے کھنچے رہا کرتے تھے۔ اجنبیت کی وجہ سے ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے وہ اس لیے کہ کس کو معلوم تھا کہ میرا ہم سفر راہ دکھانے والا ہے یا دشمن کا گمراہ کرنے والا مخبر۔ مگر بہت جلد وہ ایک دوسرے کے دُکھ درد، تڑپ اور کرب محسوس کرتے ہوئے اتنا سمجھ گئے تھے کہ ان کی حالت کینسر وارڈ کے مریضوں جیسی ہے اور بیماروں کا نام بیڈ نمبر سے جڑا ہوتا ہے۔ کوئی ہندو مریض یا مسلمان مریض

نہیں ہوتا۔ مرض ایک ہوتا ہے، علاج ایک ہوتا ہے اور دوائیاں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں!

یہ احساس یدھشٹر نے ہی ان کو دلایا تھا۔ اس لیے نہ کسی کو اپنے اصلی نام بتانے کی ضرورت پڑتی تھی اور نہ یہ بتانے کی ضرورت پڑتی تھی کہ کون کہاں سے آیا ہے اور کیوں آیا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ناطے جوڑنے کی خاطر ایک دوسرے کو دوست کہہ کر مخاطب نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ ایک مضبوط رشتہ قائم کرنے کی خاطر 'بھائی' کہہ کر ہر جملے کی شروعات کیا کرتے تھے۔ وہ غمزدہ بھائی ہی تو تھے! اور وہ یہ تو نہیں جانتے تھے کہ ان کی منزل پاس ہے یا دُور لیکن جہاں شام ہوئی وہی جگہ ان کے لیے ایک پڑاؤ بن جایا کرتا تھا! چلتے چلتے یا گئی رات تک ساتھ بیٹھ کر یدھشٹر اپنے بھائیوں کو کبھی اساطیری کہانیاں سنایا کرتا تھا اور کبھی مزے مزے کی حکایتیں سنا کر ان کا دل بہلایا کرتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے جب ان کو کوروؤں اور پانڈوؤں کے دلچسپ قصّے سنائے تب بھیم نے اس کو 'یدھشٹر بھیا' کا نام دیا تھا اور یدھشٹر نے پھر چاروں کو بھیم، ارجن، نکل اور سہدیو کے نام دیے تھے! اور یوں پانچوں اپنے مختلف عقیدوں کی وجہ سے پیدا ہوئے وسوسوں، اندیشوں اور خدشات کی آندھی پر نڈر ہو کر قابو پا کر، بکھر جانے سے ایک دوسرے کو بچایا کرتے تھے اور اپنا سفر جاری رکھا کرتے تھے۔ دُکھ جھیل کر سکھ پانے کی خاطر! واقعات اور حادثات نے پانچوں ہم سفروں کے خیالات اور جذبات ایک ایسے دائرے میں سمٹ سمیٹ دیے کہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر یوں محسوس کیا کرتے تھے کہ تاریکیوں میں چراغ جل اٹھے ہیں۔ راستوں پر نوکیلے پتھر پھول بن گئے ہیں۔ اپنے اپنے عقیدے کے مطابق وہ دل ہی دل میں عبادت یا پرستش کیا کرتے تھے اور کسی ذہنی تناؤ کو اُبھرنے نہیں دیتے تھے۔ یہ سب یدھشٹر کی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا کیونکہ جب بھی کبھی گزرے ہوئے دنوں کی بات ہوا کرتی تھی تب یدھشٹر ان راجوں مہاراجوں یا سلطانوں کے سنہری دور کا ذکر کیا کرتا تھا جو ہندو اور مسلمان دونوں کو انسان سمجھ کر شیطان کی آفتوں سے بچایا کرتا تھا۔ وہ ستم کا ذکر کرتے ستمگر کو شیطان کا نام دیا کرتا تھا اس لیے پانچوں شیطان سے نفرت کیا کرتے تھے۔ دشوار پہاڑی راستوں پر چلتے چلتے دشمن سے نظر بچا کر اپنے کٹھن سفر کو خوشگوار بنانے کی خاطر ہلکی ہلکی پھلکی ہنسانے والی گپ شپ ہوا کرتی تھی یا پھر اپنے خوابوں کی باتیں ہوا کرتی تھیں! ایک دن سہدیو نے یدھشٹر سے مذاقاً کہا۔

"یدھشٹر بھیا! ہمارے چہرے کو اب لمبی داڑھی اور لمبے بالوں نے چھپالیا ہے اس لیے بات اور ہے۔ لیکن بھیا جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تو نہ آپ کا مونچھوں کے نیچے دبا منہ

نظر آیا تھا اور نہ آپ کے ماتھے کو پھلانگ کر آگے بڑھے ہوئے بالوں کے گرہن کی وجہ سے آپ کی آنکھیں نظر آئی تھیں۔" سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے تو بھیم بول پڑا تھا۔" ابھی آپ جب مجھے دیکھ رہے تھے تب مجھے یوں لگا تھا کہ میں ایک پنجرے میں قید ہوں اور آپ مجھے جھانک جھانک کر دیکھ کر ڈرا رہے ہیں۔"

تب یدھشٹر نے ایک فلک شگاف قہقہہ مارا تھا اور یہ کہا تھا کہ تم لوگوں کی داڑھی اور بال سفر کے دوران اُگ گئے ہیں جبکہ میری داڑھی اور بال سفر سے پہلے ہی لمبے تھے اور اب بڑھ گئے ہیں۔ سوچو اگر میرے بال زمین کو چھو گئے تو میں برگد کا پیڑ بن جاؤں گا۔ اچھا ہے کہ یوں ہماری شناخت چھپی رہتی ہے۔ ہے نا؟ تم لوگ سنیاسی لگ رہے ہو اور میں ایک دیوانہ لگ رہا ہوں۔ وہ جانتا ہے کہ میرا دماغ وہ کمپیوٹر ہے جس میں ان کا وہ ضروری ڈاٹا ہے جو اُن کو کسی بھی حالت میں نہ جغرافیہ بدلنے دے گا اور نہ تواریخ! اس کے بھائی جانتے ہیں کہ دھرم راج یدھشٹر کی طرح نہ کوئی غلط کام کر سکتا ہے اور نہ وہ جھوٹ بول سکتا ہے۔ یہی وہ وجہ تھی کہ یدھشٹر نے جو بات نہایت سنجیدگی سے اپنے بھائیوں کو اشارتاً بتائی تھی وہ انھوں نے مذاق مذاق میں ٹال دی تھی۔

ایک دن راجن نے بتایا تھا کہ آسمان میں چیلیں اُڑتی ہوئی نظر آ جائیں تو بارش آ جاتی ہے۔

بھیم نے کہا تھا وہ دیکھو تیزی سے آ رہے بادل! تب یدھشٹر نے اپنے بھائیوں کو روکا تھا۔ اس روز سفر شام ہونے سے پہلے ہی روک کر وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر بکرے والوں کے چھوڑے ہوئے ایک ٹوٹے پھوٹے کچے مکان کو ہی ایک پڑاؤ سمجھ کر رُک گئے تھے۔ مگر اس رات وہ سو نہیں پائے تھے کیونکہ ایک ایسی جگہ پر وہ محفوظ نہیں تھے۔ یدھشٹر نے لب سی لیے تھے اور اس کے بھائی ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ اور یوں رات کا آخری پہر بھی گزر گیا تھا۔ مگر پانچوں بھائیوں کی دھڑکنوں کو جھٹکے دے دے کر صبح ہوئی تو آسمان میں کالے بادل گرج گرج کر برس رہے تھے۔

سہدیو نے بھیم سے پوچھا تھا۔ کاش تم بھیم پانڈو کی طرح طاقتور ہوتے؟ اگر ہوتے تو کیا ان بادلوں کا رُخ بدل سکتے؟

بھیم نے کہا تھا کہ اگر وہ ہنومان ہوتا تو اُڑ کر کالے آکاش کو نیلا بنا دیتا کیونکہ جو سورج کو اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپا سکتا ہے وہ کالے بادلوں کو چیر کر آفتاب کو نکال سکتا ہے۔

نکل نے مایوس ہو کر ارجن سے کہا تھا کہ بارش نے اس کے سارے رنگ دھو ڈالے ہیں

اب وہ تصویریں بنا کر ان کے خوابوں کی تعبیر کیسے حاصل کر سکے گا؟

ارجن نے جواباً کہا تھا کہ بارش تھم گئی ہے اور وہ دیکھو تمھارے رنگ آسمان میں نظر آ رہے ہیں۔ گن لو پورے سات رنگ ہیں قوس قزح کے!

سہدیو نے یدھشٹر سے پوچھا تھا کہ اگر ارجن سچ مچ وہ تیرانداز ہوتا جس نے اپنے تیر سے بغیر دیکھے چھت پر لٹکتی ہوئی مچھلی کی آنکھ میں تیر مار کر دروپدی کو جیت لیا تھا تو کیا وہ اپنے تیر سے قوس قزح کے رنگ آسمان سے زمین پر لا سکتا تھا؟ اور ہمارے خواب پورے کر سکتا تھا؟

یدھشٹر نے آہ بھر کر کہا تھا کہ کاش یہ صدی بھی شجاعت کی صدی ہوتی تو شاید یہ کرشمہ بھی ہوتا۔ اس نے جب اُس سے خوابوں کی تصویر بیان کرنے کو کہا تھا تب چاروں بھائی اپنے دل کے تاروں کو چھیڑ کر ایک ساتھ بول پڑے تھے:

مناظر ہوں ایک بلندی پر ایسے
ہمارے عزم بلندی پر ہوں جیسے!
عرش پر پُرسکون کشش ہو ایسے
دنیا بنانے والے کی آنکھوں میں چمک ہو جیسے!
سرسبز مخملی گھاس پر شبنم کے قطرے ہوں ایسے
پکھراج کے ہیرے بوقتِ سحر چمک رہے ہوں جیسے!

یدھشٹر بھی خوشی سے جھوم جھوم کر ان کے ساتھ گا تا رہا تھا اور پھر جب وہ اپنا سفر جاری کرنے کی خاطر نکل پڑے تھے تب یدھشٹر نے کہا تھا:

ہاں اب ہم سچ مچ پانڈو ہیں۔
اور اب ہمارے ساتھ دروپدی بھی ہے۔
ہماری دروپدی ہمارا مشترکہ خواب ہے۔

مہابھارت کا حشر دیکھ کر اس بار دروپدی اپنے کھلے بالوں کو کوروؤں کے خون سے دھو لینے کی ضد نہیں کرے گی! کیونکہ اس بار دروپدی کو دہشت گردی نے لہولہان کر دیا ہے تب بے گناہوں کا خون میدانِ جنگ میں گرا تھا اور اس بار پانڈوؤں نے معصوم بچوں، نوجوانوں، بوڑھوں، دانشمندوں، امن پسندوں، رہبروں اور فرشتہ سیرت والوں کو سڑکوں پر، گلیوں میں اور اپنے ہی گھروں میں خون سے لت پت ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ یدھشٹر جانتا تھا کہ دشمن کے کتنے

سونگھ سونگھ کر تلاش کر رہے ہیں اس لیے وہ جان بوجھ کر انجان راستوں کا انتخاب کیا کرتا تھا تا کہ دشمن اس کو دیکھ نہ لے!

اُس کے چاروں بھائیوں کو اس پر مکمل اعتماد تھا اس لیے وہی کیا کرتے تھے جو یدھشٹر چاہتا تھا۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ چاروں جب رات کا کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں کاٹ کر لائے تھے تب ان کو ایک شہری بابو ایک بیاباں میں ملا تھا۔ وہ بے ہوش تو تھا مگر زخمی نہیں تھا۔ نو جوان تھا اور شکل صورت سے ایک شہزادہ لگ رہا تھا۔ چاروں بھائی اپنے کندھوں پر اٹھا کر جب اس کو یدھشٹر کے پاس لے گئے تھے تب وہ صدیوں پُرانے ایک قلعے کے کھنڈرات میں اپنے بھائیوں کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔

ایک اجنبی کو دیکھ کر اس پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور چاروں بھائیوں کو یوں محسوس ہوا تھا کہ یدھشٹر نے اس آدمی کو دیکھا تھا مگر اپنی سلامتی کے لیے ایک اجنبی کو ہم راز نہیں بنانا چاہتا تھا۔ مگر ہوش میں آ کر جب اجنبی نے یہ بتایا تھا کہ وہ ایک یونیورسٹی کے لیے آثار قدیمہ کے بارے میں تحقیق کرنے ان کے دیار میں آیا تھا تب کچھ لوگوں نے اس کو جاسوس سمجھ کر اِغوا کر لیا تھا۔ پھر اس کو چھوڑ تو دیا تھا مگر وہ راستوں سے بے خبر ہونے کی وجہ سے بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو گیا تھا۔ یدھشٹر نے تب اس کی باتوں پر یقین کر لیا تھا جب اس نے اپنی تحقیقی صلاحیتوں اور تجربے کی دلیلیں دے کر ان کو بتایا تھا کہ جس کھنڈر میں وہ رہتے ہیں وہ پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی تہذیب و تمدن کی عکاسی کر رہا ہے۔

پانچوں بھائیوں نے اجنبی کو اپنائیت کا احساس دلایا تھا مگر تب بھی وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اس لیے خوف سے اس کی نیند اُڑ گئی تھی۔ یدھشٹر اس کی کیفیت بھانپ گیا تھا اس لیے اس کو اپنے ساتھ اس کونے میں لے گیا تھا جہاں وہ اپنے سو رہے بھائیوں کی رکھوالی کے لیے پہرہ داری کر رہا تھا۔

مگر آج اجنبی کے شناسا چہرے پر اعتماد کے تاثرات ہیں۔ آواز میں لرزش کی بجائے گرج ہے۔ اور وہ اپنے ساتھ لائے آدمی کو اصلی یدھشٹر کو ثابت کر کے لہولہان یدھشٹر سے کہہ رہا ہے۔

''تو تم یدھشٹر بن کر گھر کو گھر کے ہی چراغوں سے جلانے کا منصوبہ بنا کر حکومت کرنا چاہتے تھے؟ حکمراں بن جانا چاہتے تھے؟ ہمارے خفیہ منصوبوں کو اپنی کھوپڑی میں لے کر ہمارے دشمن کے ساتھ مل کر ہمارے آہنی ارادوں کو گرم کر کے موڑ دینا چاہتے تھے؟ مگر ایسا نہیں کر سکے تم؟ کر بھی نہیں سکتے تھے؟ باز کی نگاہوں سے ایک کبوتر چھپ سکتا ہے کیا؟ یہ بات تم نے سوچی نہیں ہوگی۔

پلٹ کر دیکھ تو لیتے ہو مگر وہ نہیں دیکھتے ہو جو ہم تم کو دکھانا چاہتے تھے۔ تواریخ داں ہونا اس لیے سوچا ہوگا کہ ہمایوں کی طرح پھر بادشاہ بن جاؤ گے اور جیسے اس نے ایک سقّے کو ایک دن کی بادشاہت دی تھی تم ان چاروں کو وزیر بنالو گے۔ وہ بھی ایک دن کے لیے؟ کیا سوچ کر ہماری تنظیم سے نکل کر بھاگ گئے تھے؟ کہ تواریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے! تب بھی اور اب بھی یدھشٹر سچ بولتا ہے یہ جان کر دنیا تمھاری باتوں پر یقین کرلے گی اور تم نہ جغرافیہ کو بدلنے دو گے اور نہ ہسٹری کو؟ میں نے جب تمھاری داڑھی اور بال صاف کر دیے تھے تب تمھاری صورت بدل دی۔ میں آرام سے اپنا کام کرتا رہا جبکہ تم تصورات کی دنیا میں کھو کر مجھے اپنے اور ان چار بے وقوفوں کے خوابوں کی کڑیاں سنا رہے تھے۔ ڈاکٹر ضمیر! جانتے ہو راجا پورس اسکندر اعظم سے کیوں ہار گیا تھا؟ اس لیے کہ اس کے اپنے ہی ہاتھیوں نے اپنی ہی فوج کو کچل دیا تھا! یاد آیا؟ تمھیں بھی تمھارے ہی بھائی کچل ڈالیں گے!

اس دوران بھیم، ارجن، نکل اور سہدیو اجنبی کے بتائے ہوئے یدھشٹر کی زبان پر ڈر کا تالہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر جانی پہچانی آواز نے پھر چونکا دیا تو وہ ایک ایک لفظ سن کر یوں محسوس کرتے رہے جیسے وہ دلدل پر پاؤں رکھ کر لرز گئے ہوں۔ آواز میں کرب و کراہن کی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

اجنبی! جو میرے ڈراؤنے چہرے سے پیار کرتے تھے وہ جب تمھارے خوبصورت چہرے کی بجائے تمھاری خطرناک چال کو سمجھ لیں گے وہ تمھارے ارادوں کو ریزہ ریزہ کر کے ایسے ہی کھنڈروں میں بکھیر دیں گے۔ تمھارا پیدا کردہ یدھشٹر ان کو روک نہیں پائے گا کیونکہ وہ ان کے مشترکہ خواب سے بے خبر ہے!

یہ سن کر نقلی یدھشٹر بول پڑا: خواب تو خواب ہوتے ہیں! خواب میں سچ کیا اور جھوٹ کیا! چلو میں تمھیں دکھادوں کہ حقیقت کیا ہے! اور جہاں میں تمھیں لے جاؤں گا وہی تمھاری منزل ہے! یہ آواز انھوں نے پہلی بار سُنی تھی جبکہ وہ پانچوں تاریکیوں میں بھی ایک دوسرے کی آواز پہچان لیتے ہیں۔

چاروں نے نقلی رہبر سے کچھ کہنے کی بجائے اس کی ہی بولتی بند کر کے اس کو کھنڈر میں پھینک دیا اور پھر اجنبی پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے بعد پانچوں بھائی آسمان میں اڑ رہے گدھوں کو دیکھ کر پہلی بار اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت اور پرستش کرنے کے بعد ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ اور گدھ شیطانوں کے چہروں سے گوشت نوچتے رہے!

OO

راہُو کیتُو

دونوں ڈاکٹر اب تک یہ جان نہیں پائے ہیں کہ وہ حساس ہیں یا ڈرپورک!
شاید دونوں! جبھی تو وہ آج سہمے سہمے سے ہیں۔ دونوں امریکہ میں شان وشوکت کی زندگی گزار رہے تھے لیکن ایک دن جب ان کے ایک بہت ہی سینئر ڈاکٹر پر، اس کے ایک مریض نے، لاپروائی برتنے کی خاطر، ایک مقدمہ ٹھونک دیا تھا تب دونوں دوست اپنے وطن لوٹ آئے تھے۔
آج دونوں کینٹین کے ایک گوشے میں بیٹھ کر بار بار گرم چائے کا آرڈر دے کر ٹھنڈی چائے کے پیالوں میں اپنے سوالات کے جوابات ڈھونڈ رہے ہیں۔ اب کیا ہوگا، کل کیا ہوگا، یا پھر علاج کے نام پر مریضوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ یہ سوالات ان کا تعاقب یوں کر رہے ہیں گویا ایک پُرسکون جھیل کی سطح پر ایک کنکر پھینکتے ہی چند دائرے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہتے ہیں!
وہ اس لیے تذبذب کا شکار نہیں ہیں کہ پچھلے کئی دنوں سے ان کی نگرانی میں دو مریضوں کے ساتھ کیا کچھ ہو چکا ہے بلکہ ایک تجسّس نے ان کے ذہن میں وسوسوں اور اندیشوں بلکہ خدشات کے اتنے سوالیہ نشانات پیدا کیے ہیں کہ ڈر کر ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ آج انھوں نے جو قدم اٹھایا ہے وہ دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہوا تو وہ رائے عامہ کے قہر سے بچ پائیں گے یا نہیں؟
آخر خبر اسپتال کے کونے کونے تک تب پہنچ گئی۔
جب خبر ہَوا کے ایک جھونکے کی طرح کینٹین میں داخل ہوئی اور آندھی بن کر وہاں بیٹھے ملازمین اور دیگر لوگوں کو خشک پتوں کی طرح اپنے ساتھ لے کر اِدھر اُدھر، یہاں وہاں اور جانے کہاں کہاں چھوڑ کر آئی۔ اور پھر سب اکٹھے ہو کر سیدھے آپریشن تھیٹر کے باہر یوں جمع ہو گئے جیسے ایک قلعے کا دروازہ توڑنے کے لیے سپاہی!
گویا اعلانِ جنگ کی صدا تھی مگر اب کیا ہوگا وہ یہ جان لینے کی خاطر خود آپریشن تھیٹر میں جانا چاہتے تو تھے مگر اعصابی مریض کا بخوبی علاج کرنے والے دونوں نیورولوجی کے ماہرین کی ٹانگیں کسی اسٹروک کی وجہ سے نہیں بلکہ خوف سے کانپ رہی تھیں!

ڈور بیٹھا کینٹین کا منیجر حیران تھا کہ ان دو ڈاکٹروں کو ایسا کیا ہوگیا ہے جو بار بار گرم چائے منگوا تو لیتے ہیں مگر پیالیوں کو بس دیکھتے رہتے ہیں اور فقط دَبے دَبے لہجے میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ دونوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے جب اس نے اپنے ریڈیو کی آواز اونچی کی تو ایک بہت ہی پرانی فلم کے گانے نے دونوں کو چونکا دیا۔ کینٹین کا منیجر بھی ساتھ ساتھ گا رہا تھا:

آسماں پہ ہے خدا اور زمیں پہ ہم
آج کل وہ اس طرف دیکھتا ہے کم
کس کو بھیجے وہ یہاں خاک چھاننے
اس تمام بھیڑ کا حال جاننے
آدمی ہیں اَن گنت دیوتا ہیں کم

اس سطر پر کینٹین کے منیجر نے ریڈیو بند کر دیا اور بآوازِ بلند کہنے لگا" ڈاکٹر صاحبان! دیوتا کم سہی مگر ہمیں بھگوان نے دو ایسے دیوتا دیے ہیں کہ آفتوں کے دور میں بھی ہمارے اس بہت بڑے اسپتال میں نہ لوٹ مار ہو رہی ہے اور نہ بم پھٹ رہے ہیں۔"

"ابھی کوئی ہنگامہ ہوا ہوگا کہیں۔ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ فوج تو حرکت میں آتی ہی ہے مگر آگ دیوتا ہی بجھا دیتے ہیں۔ دیکھا ہوگا آپ نے کئی دھارمک سیریلوں میں۔ ابھی کسی نے چنگاری پھینک دی ہوگی۔ ہمارے دو دیوتا، دو فرشتے، دو رضا کار، دو لیڈران، بے سہاروں کے مہربان اور انسانیت کے قدردان آتے ہی ایسی بارش برسائیں گے کہ چنگاریوں سے پیدا ہوئے انگارے بھی بہہ جائیں گے۔ کارِ نیک کرنے والوں کے سامنے راہو کیتو بھی آجائیں تو ہمارے دیوتاؤں کے کرم سے بہہ جائیں گے۔"

دونوں ڈاکٹروں کی سراسیمگی دیکھ کر کینٹین والا پھر بول پڑا:" راہو کیتو وہ ہیں جو انسان کو دُکھ پہنچا سکتے ہیں کیونکہ ان کی صورت دیوتاؤں جیسی ہے مگر حرکتیں خطرناک ہوتی ہیں۔ لگتا ہے آپ لوگ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں۔ دھارمک سیریل نہیں دیکھتے ہوں گے نا؟"

"میں بتا دیتا ہوں! جب امرت منتھن سے امرت کا مٹکا ملا تو وہ فقط دیوتاؤں کو پی لینا تھا۔ ایک راکھشس دیوتا کے رُوپ میں امرت پی گیا! بھگوان کو جب یہ پتہ چلا تب انھوں نے راکھشس کا سر دھڑ سے الگ کر تو دیا تھا مگر وہ مر نہیں سکا۔ امرت جو پی گیا تھا!۔!!"

"تب سے سر اور دھڑ، راہو اور کیتو، بُری سوچ اور بُرے عمل سے انسان کو پریشان کر رہے

ہیں۔ مگر بھگوان نے ہمیں دو دیوتا، دو فرشتے، دو رضا کار جو دے دیے ہیں اس لیے نہ ہمارے یہاں لوٹ مار ہو رہی ہے اور نہ یہاں بم پھٹ رہے ہیں!''

''مگر پولیس کیوں آئی ہے؟ اگر دیوتاؤں نے بلایا ہو تو معاملہ سنگین ہوگا۔''

''کہیں اس بار پھر کسی طوائف نے کسی نوزائیدہ لڑکی کو اٹھا لیا ہوگا اور رضا کاروں نے اس کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر ایسے جرائم کرنے والوں کو عبرت دینے کی خاطر پولیس کو بلایا ہو۔'' یہ کہہ کر وہ خود ٹھنڈی چائے کے دو کپ اٹھا کر گرم چائے کی دو پیالیاں میز پر رکھ کر دونوں ڈاکٹروں کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر چلا گیا۔

دونوں ڈاکٹر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ کر ڈراؤنے مناظر دیکھ رہے تھے۔ دونوں اپنے مریضوں کا برائے نام علاج کرتے کرتے اس قدر اوب گئے تھے کہ وہ نوکری چھوڑ کر کسی ایسی جگہ جانا چاہتے تھے جہاں ان کے مریضوں کو لانے والے دو رضا کار یعنی بقول کینٹین منیجر دو فرشتے نہ ہوں اور ان کا ٹھونسا ہوا سنسنی خیز ماحول نہ ہو!

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ دونوں مریضوں کی جانچ بھی وہی کرا لیتے ہیں۔ ایم. آر. آئی جیسے قیمتی ٹیسٹ بھی وہی کرا لیتے ہیں۔ علاج کا خرچہ بھی وہی اٹھا رہے ہیں اور دوسرے اسپتالوں سے ماہر معالجین کو بھی وہی لاتے ہیں۔

حالانکہ بیماروں کے ہسٹری شیٹ میں جو بھی اندراج ہوتا رہتا ہے وہ ان کے ہی قلم سے ہوتا رہتا ہے۔ مگر ایک دن پہلے دونوں کو پتہ چلا ہے کہ نوجوان مریض کے دماغ میں خون کی سپلائی بند ہونے کی وجہ سے وہ مر چکا ہے جبکہ باقی اعضا کام کر رہے ہیں اس لیے اس کو وینٹلیٹر پر رکھا گیا ہے جبکہ دونوں ڈاکٹر جانتے ہیں کہ اس مریض کا مر جانا ہی اس کے عذاب سے نجات دلانے کا واحد حل ہے۔ کم از کم وہ اس کے بے زبان درد کو خود دیکھ کر محسوس کر رہے ہیں!

دوسرے بیمار کا جسم مر چکا ہے مگر دماغ اور دل وینٹلیٹر کی مدد سے کام کر رہا ہے۔ اس کو آواز دیتے ہیں تو وہ اپنی آنکھیں کھول کر دیکھتا رہتا ہے اور پھر گہری نیند یعنی ڈیپ کوما میں چلا جاتا ہے۔ دونوں ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ اس کے بچ جانے کی زیادہ امید کی جا سکتی ہے حالانکہ یہ ممکن ہے کہ اس کی ٹانگوں پر لقوہ طاری ہو جائے۔

اپنے خیالات کو اپنے تجربات کا حوالہ دے کر جب وہ رضا کاروں سے بات کرتے ہیں تو وہ کرموں کی بات کرتے ہیں اور اچانک وینٹی لیٹر ہٹا کر آج رضا کاروں نے جب بوڑھے مریض،

جس کا نام معلوم نہیں، پتہ معلوم نہیں، مذہب معلوم نہیں کی دردناک موت پر زبردست صدمے کا اظہار کر کے جب مریض کی موت کا سرٹیفکیٹ بنانے کا حکم دیا تب دونوں اسپتال کے افسر اعلیٰ کے پاس گئے تھے مگر اس نے نہایت حلیمی سے بتا دیا تھا کہ دونوں رضا کاروں کے بارے میں ایسی شکایت کرنا اوّل تو گناہ ہے اور اگر میں یہ بات اپنے تک محدود نہ رکھ دوں تو یہ کیس کروٹ لے کر ایک جرم کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

جب ڈاکٹروں نے افسر اعلیٰ کو یہ یاد دلایا کہ ان دونوں رضا کاروں کو انھوں نے بداخلاق اور اپنی ڈیوٹی میں لاپروائی برتنے کے جرم میں نوکری سے نکال دیا تھا تب افسر اعلیٰ نے بالمیکی اور انگولی مال کی کہانی سنا کر یہ سمجھایا کہ جب وہ سنت یا بھکشو بن سکتے ہیں تو دو گمراہ نوجوان ایک نیا راستہ تلاش کیوں نہیں کر سکتے ہیں؟

افسر اعلیٰ نے ان کو یہ بھی بتایا تھا کہ شروع شروع میں میڈیا والے اُن سے پوچھتے رہے کہ جو نااہل و بدکردار آدمی آپ کے دروازے کے باہر کھڑے ہونے کے قابل نہ تھے وہ اب ان کے کمرے میں بلا جھجک داخل ہو کر روبرو بیٹھ کر ان کو ہدایات دینے کے قابل کیسے بن گئے ہیں؟ تب اعلیٰ افسر اُن کو اس راجا کی کہانی سنایا کرتا تھا جس نے اپنے نااہل بیٹے کو تخت و تاج سے بے دخل کر دیا تھا کیونکہ وہ آدھی رات کو اپنی بیوی اور بیٹے کو چھوڑ کر محل سے بھاگ گیا تھا۔ مگر وہی بیٹا جب ایک سنیاسی بن کر گھر لوٹا تھا تب راجا نے بیٹے کے پاؤں چھو لیے تھے!

بقول اعلیٰ افسر اُن دو رضا کاروں کو اُسی نے دو دیوتا کا نام دیا ہے کیونکہ وہ ایک بہت بڑے اسپتال میں کبھی کسی قسم کی بدامنی، افراتفری، یا ملازمین کی ہڑتال نہیں ہونے دیتے ہیں۔ بنگلوں میں رہ کر بھی فقیرانہ زندگی گزارتے ہیں اور وہ لاکھوں روپے جو اِن کو سودیشی اور بدیشی انسان دوست تنظیموں سے آتا ہے وہ رقوم یہ دونوں اپنے عیش و عشرت کے لیے خرچ نہیں کر رہے ہیں بلکہ خدمتِ خلق پر صَرف کر دیتے ہیں۔ اپنا گزارہ تو وہ اسپتال سے مل رہی تنخواہ سے کر رہے ہیں۔ اپنی کار کو تو انھوں نے ایمبولینس بنا رکھا ہے۔ پتہ نہیں یہ کہاں کہاں سے بے کس بیماروں کو علاج کے لیے یہاں لے آتے ہیں اور اپنے خرچ پر ہم سے کوئی رعایت مانگے بغیر! کہتے ہیں ان دونوں کو الہام سب کچھ کراتا ہے۔ پیاسا کنویں کے پاس نہیں جاتا بلکہ پانی کی لکیر ہی پیاسوں تک پہنچ جاتی ہے جبھی تو لوگ کہتے ہیں کہ:

جس کا کوئی نہیں اس کا خدا ہے!

خدا کے بعد اُس کے نام پر مدد کرنے والے ہیں!

اور وہ کوئی اور نہیں ہمارے یہ دو رضا کار ہیں!!

دونوں ڈاکٹر یہ تو جان گئے تھے کہ ان دونوں مریضوں کو رضا کاروں نے ہی ایک سیلاب زدہ علاقے سے اپنی کاروں میں اٹھا کر اس اسپتال میں داخل کرایا تھا جہاں عام طور پر بہت ہی امیر طبقے کے لوگ علاج کے لیے آتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ اپنی جان بچانے کے لیے پانی میں چلتے چلتے ایک تیز رفتار لہر کا کفن اوڑھ کر گرداب میں دفن ہو چکے تھے۔ یہ دو بیمار کیونکہ بھاگ نہیں سکتے تھے اس لیے بچ تو گئے تھے مگر وحشت سے کوما میں چلے گئے تھے۔ یعنی اگر دونوں کو رضا کار اٹھا کر نہ لاتے تو وہ کوما کی گہری نیند میں ہی ابدی نیند سو گئے ہوتے!

ابتدائی علاج سے درمیانی عمر کا مریض جب ہوش میں آیا تھا تو اس کو یہ محسوس ہوا تھا کہ اس کے جسم پر لقوہ طاری ہو چکا ہے اور وہ اپنے انجام سے باخبر تھا اور اب چاہتا تھا کہ وہ اپنی آنکھیں کسی اندھے کی تاریک دنیا میں اُجالا کرنے کے لیے دان کر دے مگر خود ہاتھ سے لکھ کر اپنی آخری خواہش کا اظہار کرنا ایک حسرت میں بدل گیا تھا اس لیے اس نے لکھ کر دینے کی بجائے اپنی لرزتی ہوئی آواز میں یہ رضا کاروں سے ٹیپ ریکارڈ کرا لیا تھا جبکہ دوسرے بیمار کی حالت ایک ویجی ٹیبل جیسی بن گئی تھی اس لیے وہ اپنے دھڑک رہے دل کے اندر کون سا طوفان یا ارمان دبائے بیٹھا تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اگر اس کا کوئی حال پوچھنے والا آیا ہوتا تو شاید ایسے بیمار کو آئی سی یو (I.C.U.) کی جکڑ سے آزاد کرنا ہی ایک کارِ ثواب تھا مگر رضا کار اُس کی حالت دیکھ کر رو پڑتے ہیں اور دونوں ڈاکٹروں کو کوشش جاری رکھنے کی ہدایات دے کر دوسرے بیمار کو آوازیں دے کر یہ تسلی دیا کرتے تھے کہ اس کا دماغ کام کر رہا ہے۔

رضا کاروں کی مداخلت شروع شروع میں ان کے شکستہ دل کا غیر ضروری ردِ عمل سمجھ کر دونوں ڈاکٹر اپنی طبی معلومات و تجربات کے حوالے دے کر اصرار کرتے رہتے تھے کہ اس کا دماغ کام کر رہا ہے، دل بھی دھڑک رہا ہے اس لیے اُسی کے علاج پر توجہ دی جائے مگر وہ دونوں باہر سے بلوائے گئے ڈاکٹر کے مشورے کو ہی ترجیح دے کر یوں ظاہر کر رہے تھے گویا پیشین گوئیاں کرنے والا ناسٹر ڈومَس کسی کے سر پر بیٹھا مہا کال دیکھ کر رو رہا ہو!

چائے اس بار بھی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور دونوں ڈاکٹر اپنے کیے پر پریشان تھے!

کینٹین والے نے ان کے احساسات کے تسلسل کو توڑ کر یہ بتایا کہ آپریشن تھیٹر میں بیٹھا

کوئی شخص اندر موجود ایک باہر سے بلوائے گئے ڈاکٹر، اُس کے ساتھ آئی ہوئی ٹیم اور ایک آپریشن کے لیے تیار مریض کو مار ڈالنے کی دھمکیاں دے کر دونوں ڈاکٹروں کو تھیٹر میں بلانے کی ضد یوں کر رہا ہے گویا ایک ہائی جیکر جہاز اُڑانے کی دھمکی دے رہا ہو۔ بقول کینٹین والا، وہ انسان دشمن راہو، اور کیتو کو ننگا کرنے کے بعد ہی آپریشن تھیٹر سے باہر آئے گا۔

دونوں ڈاکٹروں نے دوڑ کر جب آپریشن تھیٹر کے دروازے پر اپنے آنے کی اطلاع دی تب کینٹین والا بڑبڑانے لگا: ''کاش ہمارے دو دیوتا یہاں موجود ہوتے تو شاید یہ سب نہ ہوا ہوتا!''

کسی اور نے کہا کہ وہ دونوں وہاں گئے ہیں جہاں دہشت گردوں نے اندھا دُھند فائرنگ کی ہے۔ آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھل گیا تو لوگوں نے جھانک کر آپریشن کے لیے مخصوص سبز رنگ کی پوشاک پہنے، ناک اور منہ پر ماسک پہنے جن لوگوں کو دیکھا اُن میں ایک نوجوان اندھا لڑکا تھا اور وہ مریض بھی تھا جس کی موت کا سرٹیفکیٹ دونوں ڈاکٹروں نے دیا تھا۔

آپریشن کے لیے باہر سے بلائے گئے آنکھوں کے مشہور و معروف ڈاکٹر نے پولیس کو بتایا کہ اُس کو ایک مردے کی آنکھیں نکال کر ایک نوجوان اندھے کو لگا دینی تھیں اور چونکہ وہ مردے کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ دیکھ چکا تھا، اُس کی ریکارڈیڈ آواز سن چکا تھا اس لیے جب وہ مردے کو دوسرے کمرے سے لے آئے تب مردہ زندہ ہو گیا اور آپریشن روکنا پڑا۔ دونوں ڈاکٹر اپنے مریض کو بالکل نارمل حالت میں دیکھ کر چونک پڑے تو مریض بول پڑا: ''تم دونوں نے میری موت کی تصدیق کی ہے نا؟''

آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑے لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا ''صورت ڈراؤنی تو نہیں ہے مگر حرکتیں اس قدر خطرناک!'' کینٹین والا چلّانے لگا ''تو یہ دونوں ڈاکٹر راہو اور کیتو ہیں! دیوتا اِن کو کچل دیں گے!۔!!''

اُس کی بات سن کر مریض گرج کر بول پڑا ''وہ کیوں! تم کیوں نہیں؟'' یہ کہہ کر وہ دونوں رضا کاروں کے چہروں کو بے نقاب کر کے بولتا رہا ''یہ ہیں راہو اور کیتو!''

''میری آنکھیں دس لاکھ میں بیچ دی ہیں ان شیطانوں نے! اور خریدنے والا اس اندھے لڑکے کا کروڑ پتی باپ ہے! اُس دوسرے کو جان بوجھ کر اس لیے زندہ رکھا گیا ہے کیونکہ اُس کے گردوں کے خریدار کے بیٹے کا بلڈ گروپ ایک نہیں ہے ورنہ اس کو پہلے یہاں لایا جاتا۔ پانچ لاکھ کا سودا طے ہو چکا تھا۔''

رضا کار خاموش رہے مگر اُس کے خاص ایجنٹ چلاّ چلاّ کر آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑے لوگوں کو اُکساتے رہے۔ ''جھوٹ بول رہا ہے یہ راکھشس! دیوتاؤں کو بدنام کرنے کی خاطر! بھگوان نے مردے میں پھر سے جان ڈال دی یہ تو سنا ہے لیکن ایک شخص جو کوما میں تھا وہ کیسے جان گیا کہ اِن دو ڈاکٹروں نے اُس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنایا ہے؟''

''اگر یہ جان چکا ہے کہ دوسرے مریض کے گردوں کا سودا طے ہوا تھا تب تو اس کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دونوں مریضوں کو یہاں تک لانے والے دیوتا ہی تو تھے!''

''یہ سب ان دو امریکہ سے آئے ہوئے ڈاکٹروں کی کارستانی ہے۔ ہمارے اسپتال کو بدنام کرنے والے کسی دوسرے اسپتال کے دراندازہوں گے۔''

اگر ہمارے دیوتا بُرے ہیں تو وہ خود پولیس کو کیوں بلاتے؟ کیا کوئی خود اپنی گردن کاناپ دے گا؟ کیا کسی نے کسی کو اپنے ہی کندھوں پر ارتھی اٹھاتے دیکھا ہے؟''

لوگ شاید بہک کر بھڑک اٹھتے مگر پولیس کے افسر نے سب کو چونکا دیا۔ اُس نے کہا کہ ہمیں اِن دو ڈاکٹروں نے فون کیا تھا۔ وہ بھی اُن کے کہنے پر جو آپ کے اسپتال میں بطور مریض داخل ہوئے تھے مگر ہمارے خفیہ کرائم برانچ کے ایس ایس پی ہیں۔ وہ یوگا کی حیرت انگیز شکتی سے اپنے پران دماغ میں رکھ سکتے ہیں جبکہ جسم بے حس و بے حرکت ہو جاتا ہے۔ وہ اِن دو شیطانوں کی موجودگی میں اپنے جسم کو مردہ ظاہر کرتے تھے مگر اُن کی باتیں سنتے رہتے تھے۔

اُن کی بات کاٹ کر دونوں ڈاکٹروں نے جب یہ بتایا کہ وہ کسی بھی قیمت پر اور کسی کے دباؤ میں آ کر موت کا سرٹیفکیٹ نہ دینے کے لیے اپنی حکمت عملی بنا رہے تھے تب ایک نیم مردے نے ایک کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ ڈر کر بھاگنے لگے تھے مگر پلٹ کر جب دونوں نے مردے کا چیک اپ کیا تو مریض نے زبان کھول کر ایک راز کا انکشاف کر دیا۔ ان کو سرٹیفکیٹ دینے کی ہدایت دی تھی۔ ایس ایس پی کرائم برانچ نے دونوں رضا کاروں کو گرفتار کرنے کا حکم دے کر افسر اعلیٰ کو بتایا کہ ان کو دونوں رضا کاروں پر ایسے کام کرنے کا شک تو تھا لیکن ثبوت نہیں مل رہے تھے۔

کینٹین والے نے کسی سے پوچھا ''ہمارے دیوتا خوشبو کی طرح باہر آ جائیں گے۔'' جواباً اِردگرد کھڑے لوگ ایک ساتھ بول پڑے ''یہ دیوتا نہیں، ایک راہو ہے اور دوسرا کیتو۔''

''دو بدبودار راکھشس!''

''دیوتا تو یہ ڈاکٹر ہیں!!''

○○

ہنگامہ

میرے اس انوکھے شو میں حصہ لینے والے بول نہیں سکتے۔ اور میرا یہ تماشہ ایک ایسی جگہ ہو رہا تھا جہاں اونچی پرواز کرنے والے شاہین کی نگاہ پہنچ تو پاتی مگر اپنی عادت سے مجبور ہو کر وہ زمین کو نہیں آسمان کی بلندیوں کو دیکھتا رہتا ہے اور اگر وہ اتفاقاً دیکھ بھی پاتا ہے تو کس کو اور کیسے اطلاع دیتا؟ وہ بھی تو بے زبان ہے!

پھر؟ پھر میرے اس شو نے ساری دنیا میں ایک زبردست ہنگامہ کیسے برپا کر دیا؟

حیران ہوں کیوں کہ میں نے پبلسٹی تو کی نہیں۔ اور میرے سوا ایک ہی تو تماشائی تھا اور وہ دیکھتا ہے مگر بول نہیں پاتا۔ میں آسمان پر بیٹھے خدا کی بات کر رہا ہوں!!

اس نے وہ منظر بھی دیکھا ہوگا جب مجھے کون اور کب یہاں اغوا کر کے لایا تھا۔ میرا وفادار کتا سونگھ سونگھ کر میرے پیچھے پیچھے نہ آیا ہوتا تو میں یہ جان بھی نہیں پاتا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا تھا!

میرا انوکھا مگر پیارا کتا مجھ سے گفتگو کر سکتا ہے۔ جی ہاں میرے لیے تو وہ ایک کراماتی کتا ہے جبکہ اوروں کے لیے وہ ایک بے حد خوبصورت جانور ہے جو ایک مشہور و معروف ڈریس ڈیزائنر و فیشن ڈیزائنر کا پالتو کتا ہے جو کروڑوں انسانوں سے بہتر زندگی گزار رہا ہے۔ خیر جو بھی ہوا، کیسے ہوا یہ میری مدد سے ہوا تو ہے مگر یہ شو میرے تصورات کے کینوس پر اُبھر کر وجود میں نہیں آیا ہے! ہوسکتا ہے کہ یہاں آئے ہوئے دنیا بھر کے پبلسٹی ادارے میرے بارے میں جاننے کی کوشش بھی نہ کریں لیکن میری پریشانی کی وجہ تو یہ ہے کہ ہر جوہری میرے انوکھے ہیروں کو کن کن زاویوں سے دیکھ کر استعمال کریں گے! مجھے اپنے آپ پر بھی ترس آرہا ہے مگر اُس لالچی چوہے پر غصہ آرہا ہے جو ایک ریستوراں میں اپنے خالی پیٹ کی آگ بجھانے آیا تھا مگر وہاں چار سو پھیلی مہک سے لطف اندوز ہو کر نظروں کی پیاس بجھانے کی خاطر رنگ برنگی روشنیوں میں اسٹیج پر آتی جاتی خوبصورت لڑکیوں کی ٹانگیں دیکھ کر اُس کی ایک خواہش نے جنم لیا تھا۔ کاش میری بھی لمبی ٹانگیں ہوتیں!

پھر جب اس کی لڑکیوں کی بدلتی ہوئی پوشاکوں میں اُن کے بدلتے ہوئے پرکشش رنگ

رُوپ پر نظریں جمی رہی تھیں تب اس کو اپنی خوبیوں سے نفرت ہونے لگی تھی۔ ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوئے تھے اور ہر سوال کا جواب ایک اور خواہش کو جنم دیتا رہا۔ یوں وہ خواہشات کے دائرے میں اُچھلتا رہا اور دائرے کا محیط پھیلتا رہا۔

چوہے کی تاک میں بیٹھی بلّی حیران تھی کہ چوہا اس کو دیکھ کر بھاگ کیوں نہیں گیا؟ دوستی کی آڑ میں جب چوہے نے میرے فیشن شو کا آنکھوں دیکھا حال سنا دیا تو وہ بھی انسانوں کی طرح سج دھج کر رہنے کی آرزو کو دل میں بٹھا گئی! یہ بھول کر کہ وہ بھوکی ہے۔ وہ اچھل کر ایک شاخ پر بیٹھے بندر کو حرف بہ حرف سنا گئی! ان کی گفتگو سن کر کوا بھی ان کے ارادوں کو عملی جامہ پہنا دینے کے لیے ان کا ہم راز بن گیا! کوا کائیں کائیں کرتے ہوئے بے شمار کوّوں کے ساتھ جنگل کے تمام چھوٹے بڑے چرندوں اور پرندوں کے جذبات بھڑکانے میں کامیاب ہوا تھا۔ مگر عقلمند چیونٹی نے مجھے یعنی ایک ڈریس و فیشن ڈیزائنر کو اِغوا کر کے جنگل میں لانے کی تجویز رکھ دی تھی اور جنگل کے راجا شیر ببر نے بندروں کو بھیج کر مجھے اِغوا کر کے دربارِ شاہی میں پیش کیا تھا۔ تب جب میں تھک کر دن میں سو رہا تھا۔

یہ ساری کہانی مجھے اپنے کتّے نے بتا دی تھی۔ کیونکہ وہ کائنات کی زبان سمجھتا ہے، بولتا ہے اور مجھ سے ہم کلام ہوتا رہتا ہے، وہ بھی اس لیے کہ ہم دونوں اپنے پچھلے جنم میں ایک ہی مہارشی کے دو پیارے چیلے تھے۔ ایک بار ایک رقاصہ ہمارے آشرم میں زبردستی گھس آئی تھی تب میرے گرو بھائی نے اس کو بھگانے کی بجائے اس کو لالچی کتّے کی طرح دیکھا تھا اس لیے اس جنم میں کتا بن گیا ہے اور میں ایک درزی کے گھر میں پیدا ہو کر ایک مشہور معروف فیشن ڈیزائنر بن گیا۔

اور یہ سچ ہے کہ جس روز یہ کتا میرے کچے گھر میں چلا آیا تھا مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ میں کسی بچھڑے یار سے مل گیا ہوں۔ اسی روز مجھے کسی امیر زادی کی شادی کا جوڑا بنانے کا آرڈر ملا تھا اور وہاں سے میری ایک ایسی شان شوکت بھری زندگی کی شروعات ہوئی تھی، جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میری کیفیت بھانپ کر مجھے اپنے لاڈلے کتے نے بتایا تھا کہ میں اگر پتھر کو بھی چھولوں تو وہ سونا بن جائے گا۔ مگر اس بار مجھ پر یہ آفت کیسے آن پڑی۔ میرے کتّے نے مجھ پر گزری ہوئی کہانی مجھے سنا ہی دی تھی! اور نہیں تو کیا!!

ہوا یوں تھا کہ جنگل کے سارے پرندے چرندے بھگوان کے دربار میں یہ مانگ لے کر پیش ہوئے تھے کہ اُن کو بھی سج دھج کر رہنے کا موقع دیا جائے ورنہ انسان کو بھی بالوں والی کھال،

موٹی چمڑی یا پر پہنائے جائیں تا کہ وہ اپنے جسم پر خوبصورت کپڑے پہن نہ سکے اور اپنے بالوں کے اسٹائل نہ بدل سکے یا گلے میں خوبصورت ہار نہ پہن سکے۔ پاؤں میں بھاری کھال سے بنے ہوئے خوب صورت جوتے نہ پہن سکے بلکہ اپنے سر پر ہمارے بچوں کی ملائم کھال کی بنی ہوئی ٹوپیاں نہ پہن سکے۔ بھگوان نے ان کی مانگ اس حد تک مان لی کہ وہ اپنے اپنے جسم میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کروا سکتے ہیں تا کہ وہ بھی سج دھج کر رہ سکیں۔

میں سمجھ گیا تھا کہ مجھے بطور ایک فیشن ڈیزائنر اور بطور مہمانِ خصوصی بلایا گیا ہے نہ کہ ایک شکار یہاں لایا گیا ہے۔

بھلا ہو میرے کتے کا جو میں چرندوں پرندوں بلکہ کیڑے مکوڑوں کی فرمائش سن سکا اور کچھ کر سکا۔ اور کئی دنوں کی محنت جب رنگ لائی تب میرے سامنے ایک سحر انگیز منظر تھا۔

صرف میں اور میرا وفادار کتا اپنی شکل وصورت میں تھے باقی سب یا تو لبادوں سے مختلف نظر آ رہے تھے یا پھر حسبِ منشا جسمانی تبدیلیوں کی وجہ سے ایجاد کی گئی مخلوق نظر آ رہے تھے۔ میں خود حیران تھا کہ میں کینوس پر اپنی بنائی ہوئی ایک تصویر دیکھ رہا ہوں ایک بیابان کو آباد کرنے والی مخلوق دیکھ رہا ہوں۔ آفتاب کے بدلتے ہوئے زاویوں سے مخلوق کے سائے لمبے سے چھوٹے اور پھر چھوٹے سے بڑے نہ ہوتے رہتے تو میں تصورات کی دنیا میں کھو گیا ہوتا۔ دراصل یہ ایک تماشہ تھا، جس کو دیکھ کر بھگوان بھی ہنس پڑا تھا اور میں بھی! اور نہیں تو کیا!!

چوہے نے شتر مرغ کی دو ٹانگیں لے کر اپنی چار ٹانگیں شتر مرغ کو دی تھیں۔ بلی نے ایک سنہری وِگ پہن رکھی تھی اور اجگر اُس کو نگل جانے کی بجائے اُس سے لپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہاتھی نے اپنی سونڈ پر مور پنکھ لگائے تھے اور اپنے لمبے دانت بدلے میں مور کو دے دیے تھے۔ کیونکہ وہ وزن اٹھا نہیں پا رہا تھا اس لیے دانتوں کو زمین پر کھڑا کر کے ان کے سہارے خود کھڑا تھا۔ ژراف نے اپنی بہت ہی لمبی گردن پر ایک شیروانی پہن لی تھی۔ بلی نے اپنی اگلی دو ٹانگوں میں جینز پہن رکھے تھے اور پچھلی دو ٹانگوں میں شلوار پہن لی تھی اور وہ بار بار اپنے دوپٹے کو سرکا کر شیر ببر کو لبھا رہی تھی، نظروں کے تیر مار کر! شیر ببر نے ایک راجستھانی پگڑی پہن رکھی تھی اور وہ ایک درخت کے نیچے یوں سُر اور لے کا خیال رکھتے ہوئے گرج رہا تھا گویا میگھ ملہار راگ گانے کی کوشش کر رہا ہو۔ گوریلا نے ایک غرارہ پہن کر اپنی چھاتی کو ایک شال سے چھپا لیا تھا جبکہ کوّے نے طوطے کی چونچ اور سبز رنگ کے پر فٹ کرائے تھے۔ طوطے نے اپنی آنکھوں پر کالے

رنگ کا چشمہ پہن کر طوطا چشم کے محاورے کو جھوٹ ثابت کر کے ایک مینا کے پر لگائے تھے۔

ہُد ہُد نے شاخ چھوڑ کر ایک اونٹ کے سر پر بیٹھ کر گانا شروع کیا تھا جبکہ ایک رومانی گیت کے اثر سے چیونٹی اونٹ کو دل دے بیٹھی تھی اس لیے سج دھج کر اونٹ کے ہونٹوں کا بوسہ لینے کی خاطر اونٹ کی ٹانگوں پر یوں چل رہی تھی جیسے شیریں فرہاد سے ملنے کی خاطر پہاڑی پر چل رہی ہو۔ بکری نے بندر کے ہاتھ پاؤں فٹ کر کے اپنے بچے کو گود میں اُٹھالیا تھا جبکہ ایک گھوڑی ایک مہین سانائٹ گاؤن پہن کر ایک درخت کے نیچے یوں دائیں بائیں تیکھی نظروں سے دیکھ رہی تھی گویا ایک دلہن سہاگ رات منانے کے لیے اپنے شوہر کی آمد کا انتظار کر رہی ہو۔

ایک سانڈ نے اپنی کالی گردن میں ایک رنگدار ٹائی پہن رکھی تھی جبکہ بیل نے ایک سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ شیرنی پر لائن مار رہا تھا۔ شیرنی سامنے کھڑے کوبرا کے چمکیلے دانتوں کو دیکھ کر اپنے دل پر مشکلاً قابو پا چکی تھی کیونکہ کوبرا اپنی بیوی کے ساتھ چوہے کی لمبی ٹانگوں سے یوں لپٹ گیا تھا جیسے صنوبر کے درخت سے لپٹی ہوئی ایک بیل! اور شیرنی کو لگ رہا تھا جیسے ایک عاشق نے جدید لباس کی بجائے قدامت پسند دولہے کا چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا ہے۔ لمبی ٹانگوں پر کھڑا چوہا یوں نظر آ رہا تھا جیسے دولہے کے ماتھے پر لگا ہوا نظرِ بد سے بچنے کی خاطر 'کالا تلک! گدھے نے اپنے مالک، دھوبی کی پوشاک پہن لی تھی اور وہ پگڑی پہن کر ایک ڈرامائی کردار نظر آ رہا تھا!

بندروں نے امریکن طرز کے کپڑے پہن لیے تھے اور وہ ایک دوسرے کو چھیڑ کر ایک رنگین ماحول بنا کر بیہودہ حرکتیں یوں کرتے رہتے ہیں گویا جنسی رجحانات کو بھڑکا کر نئے نئے ملبوسات و فیشن کے طریقوں کا مظاہرہ کر رہے ہوں۔ اور اُن تمام جانوروں کو جنھوں نے اپنی چھاتی (پستان یا تھن) چھپا کر رکھے تھے، نیم عریاں رہنے کے لیے اُکسا رہے تھے۔ ریچھ نے اپنے جسم کے تمام بال کاٹ لیے تھے اور وہ سر پر ایک سٹرا ہیٹ رکھ کر ایک رومیو کی طرح تمام چرندوں اور پرندوں کے آس پاس گھوم گھام کر اپنی جوانی و جسم کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

بے چارہ گینڈا کئی بار مجھ سے پوچھ چکا تھا کہ کیا وہ اپنے بدن سے بکتر اُتار کر ریچھ کی طرح کیسے ایک خوبصورت جسم کا مظاہرہ کر سکتا تھا؟

یہ تمام تبدیلیاں میری ہی وجہ سے ممکن ہو پائی تھیں بلکہ میرے ہاتھوں سے ہی تو یہ چمتکاری شو وجود میں آیا تھا۔ لیکن کیسے؟ یہ میں ہرگز جان نہیں پاتا اگر مجھے مجھ سے ملنے آئی ایک ڈائن اور چھپ چھُپ کر مدد کرنے والا ایک وَن مانش یہ نہ بتاتے کہ یہ شوڈنیا بنانے والے نے خود ترتیب دیا تھا

جبکہ میں ایک بہانہ تھا! میں حیران ہوں کہ یہ بات میرے کتے کو بھی معلوم تھی۔ کیاان میں سے کسی نے ضرورت مند اشتہاری کمپنیوں کے ذریعے اس شو کے بارے میں پبلسٹی کی تھی؟ میں نے اپنے کتّے سے پوچھا تو جواب ملا۔نہیں! نہیں! ایسا نہیں!!

دراصل یہ شو آسمان میں موجود انسان کے لیے ایجاد کیے ہوئے ایک مصنوعی سیارے نے دن رات دیکھ کر دنیا کے مختلف ٹیلی ویژن چینلوں سے دنیا کو دکھایا تھا۔ لوگوں نے جس کو ایک دلچسپ پروگرام کی طرح دیکھا تھا یا پھر ایک کوفت پیدا کردینے والا پروگرام سمجھ کر نہیں دیکھا تھا اس شو کو اشتہاری کمپنیوں نے نہایت سنجیدگی سے دیکھا تھا۔ مگر اپنے نقطۂ نگاہ سے! جبھی تو وہ ہیلی کاپٹروں میں اپنی تخلیقی ٹیم اور اپنے مقصد لے کر ایک ایسے بیابان میں آئے تھے جہاں مجھے اِغوا کر کے لایا گیا تھا تا کہ کوئی ٹوتھ پیسٹ، کوئی کولڈ ڈرنک، کوئی صابن اور کوئی کپڑے، پوشاکیں وغیرہ عام ضروریاتِ زندگی کے علاوہ فیشن کے دیوانوں کے لیے میرے ماڈلوں کو دیکھ دیکھ کر نئے نئے ڈیزائنوں کو ایجاد کر کے زندگی کو پُر کیف بنایا جا سکے!

یوں ایک جنگل میں ایک ہنگامہ برپا ہوا تھا اور سبھی مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے تا کہ بقول میرے وفادار کتّے کے میں خود ڈائن اور وَن مانش کو ڈھونڈ رہا ہوں تا کہ ان سے پوچھ سکوں کہ انھوں نے اپنا حلیہ کیوں بدلنا چاہا!

یہ سوال میں نے اپنے کتّے سے پوچھا تو میں جان گیا کہ ڈائن وہ اپسرا ہے جس نے اپنے پچھلے جنم میں میرے کتّے یعنی ایک رشی کی تپسیا بھنگ کر دی تھی اس لیے وہ دنیا بنانے والے کی رضا میں راضی ہے۔ وَن مانش پچھلے جنم اور اگلے جنم میں یقین نہیں رکھتا اس لیے وہ صدیوں سے زندہ ہے اس لیے اس کے جسم پر بال اُگ گئے ہیں۔ وہ انسان ہو کر بھی انسانوں سے ڈرتا ہے۔ اُس کی سوچ کے پس پردہ ایک کہانی ہے۔

وہ ایک شہنشاہ کا بڑا بیٹا اور وارثِ تخت و تاج تھا۔ وہ چونکہ ایک عابد تھا، مستانہ تھا، ایک فقیر تھا اس لیے اس کا چھوٹا بھائی اپنے والد محترم کے انتقال کے بعد شہنشاہ بن گیا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے پیچھے پیچھے چلا کرتا تھا وہ اس لیے کہ وہ چاہتا تھا کہ وہی تخت و تاج سنبھال کر رعایا کو نیک راہ پر لا سکے مگر فقیر کو اپنے فقیری سے پیار تھا اور اکثر کہا کرتا تھا کہ دیوانہ ہوں، دیوانوں کی باتیں نہیں کروں گا تو اور کیا کروں گا جس حال میں ہوں ٹھیک ہوں۔

اس کے لہولہان پاؤں دیکھ کر چھوٹے بھائی نے اپنے بڑے بھائی کو اپنی تڑپ کا واسطہ دے کر

جوتے پہن لینے کے لیے راضی کر لیا تھا۔ دیوانہ خوبصورت جوتے دیکھ کر چاہت کے پھیل رہے دائرے میں داخل ہو کر سوچنے لگا۔ پاؤں میں جوتے ہوں تو ٹانگیں کیوں ننگی ہوں؟ ٹانگوں پر زرق برق شلوار ہو، تو بدن پر شاہی پوشاک کیوں نہ ہو! شاہی پوشاک پہن لی تو سر پر تاج کیوں نہ ہو؟

اس سے پہلے کہ ایک راہی بہک کر اپنے راستے سے بھٹک جاتا اور بھڑک کر اپنے چھوٹے بھائی کے سر سے تاج اٹھا دیتا دیوانے نے جوتے اُتار کر ایک ندی میں ڈال دِیے اور اپنے کھو چکے سکون کو حاصل کرنے کے لیے شہر سے بہت دُور جنگلوں میں سکون تلاش کرنے آیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ جوگی کا شہر میں ٹھکانا کیا!

وہ گھبرا گیا تھا کیونکہ جنگل میں بھی ایک ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ اور وحشی درندے بھی ماڈل بن کر اشتہاری فلموں میں کام کر رہے تھے۔ اپنے بدلے بدلے رنگ رُوپ میں کوئی اپنے دانتوں کی نمائش کر رہا تھا اور کوئی اپنی جنسی کشش کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

حالانکہ اس شو کا خالق میں ہی تو ہوں، مگر مجھے گھٹن ہو رہی ہے کیونکہ مجھے پیاس لگی ہے اور بھوک بھی۔ ڈر رہا ہوں کہ پانی کو ہاتھ لگاؤں تو ندی کا بہتا ہوا پانی سونا نہ بن جائے اور کھیت پیاسے نہ رہ جائیں۔ لوگ بھوکے نہ رہ جائیں؟

اپنے کئی سوالات کی گونج نے گرج بن کر میرے خیالات و احساسات کے تسلسل کو توڑ کر جب مجھے چونکایا تب میرے سامنے ایک نیا ہنگامہ کرنے کا ایک نیا منصوبہ تھا! ہاں ہاں — اور نہیں تو کیا!! —!!!

OO

شکست

ہیما جب میڈیکل کالج کے احاطے میں داخل ہوئی تب بہت دیر ہو چکی تھی!
وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ نیم دوڑتے ہوئے اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور اُس کی دَبی دَبی آواز میں لرزش تھی! ایسا بھی نہیں تھا کہ کوئی اُس کی باتیں سمجھ نہیں پا رہا تھا مگر ہر کوئی اُس کو مشکوک یا نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر اُس کو نظر انداز کر رہا تھا کیونکہ یہ خبر بدبو کی طرح سارے کالج میں پھیل چکی تھی کہ کل شام وہ گیسٹ ہاؤس سے، امریکہ سے آئے ہوئے ہندوستانی نژاد بین الاقوامی شہرت یافتہ نیورو سرجن کو ایک آٹو میں اپنے ساتھ لے گئی تھی اور خود تو آج بعد دوپہر لوٹ کر آ گئی تھی مگر ڈاکٹر کو کہیں چھوڑ کر! کہاں؟ یہ کوئی جاننے میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا! ہاں مگر چند بُردبار ڈاکٹروں کے لیے دونوں کا ایک دوسرے سے کام نکلنا ایک معمہ بن چکا تھا کیونکہ ڈاکٹر کی شخصیت ایک مہارشی جیسی تھی جو کارِ نیک کر کے واپس اُس غار میں جایا کرتا تھا جہاں وہ الگ تھلگ ہو کر تپسیا کرتا رہتا ہے! شکل وصورت سے بھی وہ اپنے لمبے بے ترتیب سفید بالوں اور لمبی داڑھی کی وجہ سے ڈاکٹر کم اور مہاتما زیادہ نظر آیا کرتا تھا لیکن آج اُس کی شخصیت برہنہ ہو کر رہ گئی تھی۔ کیا وہ واقعی ایک بناوٹ اور پھر دکھاوٹ کا سہارا لے کر اپنے آپ کو اس بلندی پر لے گیا تھا جہاں سے وہ ایک انکشاف کی وجہ سے گر کر آج چکنا چور ہو گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ان کو شاید ڈاکٹر کو پہچاننے میں غلطی ہوئی تھی وہ بھی اس لیے کہ وہ جب سے آیا ہے تب سے سحر سے پہلے آپریشن تھیٹر میں پہنچ کر پہلے چند ویدک منتروں کا جاپ کر کے آپریشن کرتا ہے اور وہ بھی چپ چاپ مددگار ڈاکٹروں کو اشاروں سے ہدایات دے کر یوں اعصابِ انسان کے ساتھ اپنی انگلیوں سے یوں اِدھر اُدھر کرتا ہے گویا ستار کی تاروں کو چھیڑ کر زندگی بخشنے والے راگ بجا رہا ہو! پھر وہ مرض کے بارے میں اور آپریشن کے بارے میں تمام پیچیدگیوں کے بارے میں تفصیلی لکچر دیتا ہے۔ خود ہی سوالات کرتا ہے اور خود ہی جوابات دے کر چلا جاتا ہے۔ اور یہ چار پانچ گھنٹے کا سلسلہ اسمبلی ہال میں بیٹھے سینئر وجونیئر ڈاکٹر ویڈیو کیمرے کی مدد سے ایک

اسکرین پر دیکھ لیتے ہیں۔ اور میڈیکل سائنس کے کرشمات دیکھنے والوں کے علاوہ منتظمین بھی ڈاکٹر سے نہ تو تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں اور نہ سوال و جواب، کیونکہ آپریشن تھیٹر سے وہ کسی سے بھی نظریں ملائے بغیر کھسک کر گیسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں گھس کر گویا ایک غار میں جا کر غار کا منہ بھاری پتھر سے بند کر دیتا ہے۔ اور وہ پتھر فقط چوکیدار جگن ناتھ کو ہٹانے کی اجازت ہے۔

جگن ناتھ پوجا پاٹھ کرنے والا ایک نہایت شریف آدمی ہے۔ جس کے ساتھ ڈاکٹر خوب گھل مل گیا ہے اور ہر شام وہ اپنا ایئر کنڈیشنڈ کمرہ چھوڑ کر اس کے چھوٹے سے کمرے میں فرش پر بیٹھ کر اس کے ساتھ کھانا کھاتا ہے مگر جب وہ بھی اپنے دوسرے کمرے میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے تب وہ اپنی آمد کا احساس دلائے بغیر اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔

یہ باتیں منتظمین کو جگن ناتھ نے ہی بتائی تھیں اور میڈیکل کالج میں سب کو معلوم ہوئی تھیں۔ مگر یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر اور ہیما کا آمنا سامنا کرانے والا جگن ناتھ ہی تھا۔

کیا جگن ناتھ کی شرافت بھی بناوٹی ہے اور وہ دلالی کرتا ہے؟ یا پھر ہیما ہی ڈاکٹر کی قابلیت سے متاثر ہو کر ایک سوئی کی طرح اس مقناطیس سے چپک گئی ہے؟

بردبار ڈاکٹر اس پہلو پر سوچتے رہے اور ان کی دَبی دَبی بحث ڈاکٹر دیپک کول سن تو رہا تھا مگر کچھ بول نہیں رہا تھا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اُس کی ذہین ترین طالبہ ہیما بے حد خوبصورت ہونے کے ساتھ خوب سیرت بھی ہے۔ بہت ہی امیر ہونے کے باوجود نہ تو مغرور ہے اور نہ اپنی پڑھائی کے علاوہ کسی اور چیز میں دلچسپی لیتی ہے۔ اُس کی نظر میں ڈاکٹر ہی قصوروار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا مکاّر ہے جو سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے بناوٹ کے کردار سے اپنے مہان ہونے کا ڈراما کر رہا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اسمبلی ہال میں ایک تاجدار لڑکے کی طرح آپریشن تھیٹر میں ہو رہی سرگرمیوں کو ایک اسکرین پر دیکھنا بلیک بورڈ پر کھینچی گئی لکیروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

اس کی نظر میں ایک این آر آئی ڈاکٹر کے. داس اگر چودہ برس بعد اپنے وطن لوٹ کر آیا ہے تو وہ بھگوان رام کی طرح اپنی پرجا کے دُکھ درد میں شامل ہونے کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ ایک امیر ترین ملک میں بہت ساری دولت سمیٹنے والا اپنے ملک میں اپنے قد کو بہت اونچا کرنے کے لیے اپنے خرچے پر وہ آپریشن کرنے آیا ہے جو یہاں کے ڈاکٹر بھی کرتے آئے ہیں۔ بقول ڈاکٹر دیپک کول یہ ایک فیشن بن گیا ہے کہ این آر آئی سرخیوں میں رہنے کی خاطر کبھی غریب پرور بن جاتے ہیں تو کبھی وطن پرست، کبھی کسی سماجی تنظیم کے سرپرست بن جاتے ہیں اور کبھی کسی سیاسی پارٹی

کے بانی بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر کول آج بھی ہال میں موجود نہیں تھے۔ مگر نیرولوجی ڈپارٹمنٹ کے سبھی سینئر اور جونیئر ڈاکٹروں کی نظریں اسکرین پر تب تک جمی تھیں جب تک ان کو یہ اطلاع دی گئی کہ کرشماتی ڈاکٹر معمول کی طرح آج سحر سے پہلے نہیں آیا ہے اور وہ گیسٹ ہاؤس میں بھی نہیں ہے تب بھی لوگوں کو ڈاکٹر کے. داس جس کو وہ احتراماً ڈاکٹر مسیحا کا لقب دے چکے تھے، کے بارے میں تشویش پیدا ہوگئی تھی اور وہ کارِ بد کے لیے ڈاکٹر دیپک کول کو ہی شکوک کے دائرے میں لے کر قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ لیکن جب ان کو یہ پتا چلا تھا کہ وہ ہیما کے ساتھ کہیں چلا گیا ہے تب وہ یوں بکھر گئے تھے جیسے ایک کیرم بورڈ کے بیچ میں ایک لال گولی کے اِرد گرد ترتیب سے رکھی ہوئی سفید اور کالے رنگ کی گوٹیاں اسٹرائیکر کی زوردار ٹکر سے بکھر جاتی ہیں اور اتفاقاً لال گوٹی یعنی رانی اُچھل کر کہیں کھو جاتی ہے۔

ہیما جو روز ہال میں موجود ہوا کرتی تھی آج کہیں نظر نہیں آ رہی تھی حالانکہ اُس کی لال رنگ کی کار احاطے میں موجود تھی۔ یہ دیکھ کر یا جان کر کچھ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے، کچھ لوگ بڑبڑاتے رہے، کچھ صبر و تحمل کا اظہار کرتے رہے اور بیشتر لوگ اپنے غصّے کو پیتے رہے مگر ڈاکٹر کے. داس کے بارے میں وہ بھی کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔

معاملہ جب تشویش اور تذبذب کے محیط سے باہر چلا گیا تب ڈاکٹر کول نے تمام ڈاکٹروں کو اسمبلی ہال میں بلا کر اپنی گرجدار آواز میں کہا ''اگر آپ سب لوگ مریض کے بارے میں پریشان ہیں تو بے فکر رہیے میں یہ پیچیدہ آپریشن کروں گا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہمارے ہی ڈاکٹر امریکہ میں آپریشن کر کے یہاں آ کر ہمارے مسیحا بن جاتے ہیں۔ مگر اگر آپ ڈاکٹر کالی داس شرما یعنی ڈاکٹر مسیحا کے بارے میں فکر مند ہیں تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ وہ کوئی ایسا کام کرنے گیا ہوگا جس سے وہ کسی کو شکست دے کر اپنے احساسِ کمتری پر قابو پا کر ایک اور جیت کا دعویٰ کر کے اپنے احساسِ برتری کا جھنڈا لہرا سکیں!

جی ہاں کے. داس کا اصلی نام کالی داس شرما ولد مرحوم امرناتھ شرما ہے۔ ان کو اپنا نام اس لیے اچھا لگ رہا تھا کیونکہ جب وہ اپنے باپ کا ایک ڈاک بنگلے میں افسروں کی سیوا کرنے میں ہاتھ بٹایا کرتا تھا تب اُس کو کالو کے نام سے آوازیں دے کر نوکروں کا کام کراتے تھے۔ ایک بار ضلع کے ڈپٹی کمشنر اپنی فیملی کے ساتھ ڈاک بنگلے میں رہنے آئے تو کالو کو ان کی اِکلوتی بیٹی جیا کے

جوتوں کی پالش کرنی پڑی تھی۔ غلطی سے لال رنگ کے جوتے پر کالے رنگ کی پالش لگانے کی وجہ جیا کی ماں ایک بارہ برس کے لڑکے پر برس پڑی تھی۔ کالو کے باپ نے معافی مانگ لی تھی مگر ڈی سی صاحب نے کالو کو جانے کیا کہا تھا کہ وہ رات بھر میرے کمرے میں روتا رہا تھا۔ ہاں ہم دونوں ہم عمر ہیں اور ایک ہی کلاس میں پڑھا کرتے تھے۔ دونوں پڑھائی میں اچھے تھے اور زندگی میں کچھ کرنے کی تمنا تھی۔ حالانکہ دونوں غریب تھے اور میرے ابا ایک چپراسی تھے۔ لیکن مجھے ان کی وجہ سے کسی قسم کا احساسِ کمتری نہیں تھا۔

ہم دونوں میں یہی تو فرق تھا کہ کالو ہمیشہ یہ سوچتا رہتا تھا کہ جس دن وہ ایک افسر بن جائے گا اُس دن اس کو ذلیل کرنے والوں سے گن گن کے بدلے لے گا جبکہ میرا نظریہ یہ تھا کہ میں اگر ایک افسر بن جاؤں گا تو میں چھوٹے ملازموں کے ساتھ اچھا سلوک کروں گا۔ یعنی وہ لڑکپن سے ہی اپنے سینے میں انتقام کے شعلوں کو بجھنے نہیں دیتا تھا جبکہ میں انقلاب کا پرچم بلند کر کے انسانیت کو فروغ دینا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر کے.داس کے چاہنے والوں نے جب ڈاکٹر دیپک کول سے پوچھا کہ کیا اُس نے اپنے بچپن کے دوست کو پہچانا تھا، اور کب؟

ڈاکٹر کول نے بتایا کہ جو ٹیکسی ڈرائیور ڈاکٹر شرما کو ایئر پورٹ سے کالج کے گیٹ پر چھوڑنے آیا تھا اُس کو ایک لمبے سفر کے دوران اپنائیت کا احساس دلا کر سمجھا دیا تھا کہ وہ غریبوں کو غیر نہیں سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے ٹیکسی ڈرائیور اُن سے بے تکلف باتیں کرتا رہا۔ وہ آپ سے تم پر آچکا تھا۔ ٹیکسی سے اُتر کر بھی دونوں تفصیلی گفتگو کرتے رہے اور سیڑھیوں پر کھڑا ڈاکٹر کول ان کی باتیں سن رہا تھا مگر چونکہ ڈاکٹر شرما کی پیٹھ اس کے سامنے تھی اس لیے اس وقت وہ ان کو پہچان نہیں پایا تھا۔ بلکہ یہ دیکھ کر وہ تب خوش ہوا تھا جب ڈاکٹر شرما نے ٹیکسی والے کو دوگنے پیسے بھی دِیے تھے اور اپنی اٹیچی کھول کر چند قمیضیں بھی بطور تحفہ دی تھیں، پھر اچانک ڈاکٹر شرما نے قہر آلود غصّے میں آ کر تحفے واپس لیے تھے اور میٹر کے علاوہ دِیے گئے پیسے بھی واپس لے لیے تھے۔ ٹیکسی والا فوراً بھاگ گیا تو ڈاکٹر کول نے بدلی بدلی صورت کے باوجود اپنے دوست کو پہچان کر اپنا ہاتھ آگے بڑھا تو دیا تھا مگر احساسِ کمتری کے شکار ڈاکٹر شرما کو ٹیکسی ڈرائیور کی بات گولی کی طرح لگ گئی تھی جب اس نے یہ ان سے یہ پوچھا تھا کہ آپ کو سوٹ اور ٹائی پہن کر گرمی نہیں لگتی ہے۔

ڈاکٹر کول کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر شرما کو سوٹ پہن کر ہی احساسِ برتری کا اظہار کرنا پسند ہے

اس لیے ان کا آگ بگولا ہونا تو ایک فطری عمل تھا۔

ڈاکٹر کول کو کالج کے مہمانِ خصوصی کے بڑا پن دکھانے کی وہ ادا نہایت گھٹیا لگی تھی جب اس نے ایک دوست کے خوش آمدید کرنے والے ہاتھ میں ڈرائیور سے چھینی ہوئی قینچیں دیکھ لی تھیں اور وہ دونوں بات کیے بغیر آگے چل پڑے تھے۔

ڈاکٹر کول تب سمجھ گیا تھا کہ عمر کے ساتھ شکل بدل سکتی ہے، دولت سے صورت بدل سکتی ہے مگر اپنی سوچ نہ بدلنے کی وجہ سے انسان کی نہ خصلت اور نہ فطرت بدل سکتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے شعبے کے لوگوں سے الگ ہو چکا تھا۔ حالانکہ دل کی بات اُس نے آج بتادی تھی اور یوں ڈاکٹر کالی داس کا بچپن سے جوانی تک کا کچا چٹھا اپنے شعبے کے لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ڈاکٹر کالی داس کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا بلکہ ایک اچھے ڈاکٹر کی طرح بیماری کی علامتیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ ایک بیمار کا علاج ہو سکے!

اس کی نظر میں اس کا ایک وقت کا اکلوتا دوست بچپن سے ہی احساسِ کمتری نام کی لاعلاج بیماری کا شکار ہے اور اس کا بس چلے تو وہ ایسا احساس دلانے والے کو ایک مکوڑے کی طرح مسل دے!

کالی داس اور دیپک کی زندگی کی داستانیں ملتی جلتی ہیں۔ فرق اگر ہے تو فقط یہ کہ دیپک ایک ٹھکانے کو ہی اپنی منزل سمجھتا تھا جبکہ کالی داس آسرا دینے والوں کو آج محسن سمجھنے کی بجائے بیتے کل کا دشمن سمجھ کر شکست دینا چاہتا تھا!

دونوں نے دسویں کا امتحان بہت اچھے نمبر لے کر پاس کیا تو دونوں اپنے اپنے باپ کے افسروں کے گھروں میں سرکاری نوکری ملنے کے لالچ میں کالو اور دیپو بن کر نوکری کرنے گئے تھے۔ مگر دونوں خوش بخت ثابت ہوئے کیونکہ دیپو کے مالک کا بیٹا گند ذہن تھا اس لیے اس کی کتابیں پڑھ کر وہ اس کو پڑھایا کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر دیپو کے مالک نے اس کو اسکول بھیجا تھا کالو ضلع کے ڈی سی کے گھر کام کرتا تھا جہاں اس کو نہ صرف اچھا کھانا ملا کرتا تھا بلکہ پہننے کے لیے اچھے اچھے کپڑے بھی ملا کرتے تھے۔ پڑھنے کو ڈی سی صاحب کی اِکلوتی بیٹی کی کتابیں بھی میسر تھیں۔ اس لیے وہ خوش تھا مگر ایک دن وہ جان گیا تھا کہ وہ لڑکی جس کے جوتوں پر اس نے غلطی سے یا پھر معصومیت کی وجہ سے غلط رنگ استعمال کیا تھا وہ اسی کی کتابیں پڑھتا رہتا ہے تو راکھ کے نیچے دبے انتقام کے شعلے ہوا دینے سے پھر دہکنے لگے تھے حالانکہ ڈی سی کی بیٹی جیا کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی کہ ایک اَن پڑھ چوکیدار کا بیٹا ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھ لکھ کر ایک ڈاکٹر بن جانا چاہتا ہے۔

جیا نے اپنے باپ کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ کالو کو اسکول بھیجا جائے اور یوں اُس کو گھریلو کام کرنے سے نجات بھی مل گئی اور جیا کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا موقع بھی۔

جیا کو گھر پر ٹیوشن دینے والے قابلِ ترین لکچرار کالو کو بھی پڑھاتے تھے اور وہ اسکول میں دیپو کو وہ سب سمجھا دیتا تھا جو وہ سیکھ کر آتا تھا۔ دیپو کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوتی تھی کہ جیا کالو کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ کالو کے اندر اُبل رہا لاوا ٹھنڈا ہو چکا ہوگا مگر وہ نا سمجھ کالو کی کیفیت بھانپ نہیں سکا تھا۔ کالو کو جیا پر غصہ اس لیے آتا تھا کہ جیا اُس کو لکچرار کے لیے چائے پانی لانے کو کیوں کہتی ہے اور وہ بار بار اُس کے باپ کے حوالے سے گھر میں پکائے کھانے میں نقص کیوں نکالتی رہتی ہے بلکہ اپنی سہیلیوں کو بھی کیوں بتا دیتی ہے کہ اُس کا باپ ایک بے مثال باورچی ہے بلکہ اُس کو یہ بھی اعتراض تھا کہ جیا اس کو کالو کی بجائے کالی داس کہہ کر مخاطب کیوں نہیں کرتی!

دیپو اس کو اپنی اوقات اور جیا کے بڑے پن کے بارے میں سمجھا کر یہی سمجھ بیٹھتا تھا کہ اس نے آگ پر پانی ڈالا ہے مگر دوسرے دن کالو وہی زہریلے تاثرات لے کر اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ یعنی مجھے مہمانوں سے نہیں ملایا جاتا ہے، مجھے پرانا رین کوٹ دیا گیا۔ مجھے بیڈمنٹن اس لیے کھیلنے نہیں دیا جاتا کیونکہ مجھ سے شکست کھانے کا ڈر جیا کے بدن میں لرزش پیدا کر دیتا ہے۔

اور جب بھی دیپو جیا سے ملتا تھا تب اس کو یقین ہو جایا کرتا تھا کہ جیا کو کالو کی چھپی ہوئی کیفیت کے بارے میں علم ہی نہیں ہے۔ کئی بار وہ اپنی کار میں دونوں دوستوں کو اسکول کے قریب چھوڑ آیا کرتی تھی۔ مگر احسان مند ہونے کی بجائے کالو بڑبڑاتا رہتا تھا، احسان تو تب ہوتا اگر جیا ہمیں اسکول کے احاطے کے اندر چھوڑ آتی! کالو کے غیر مناسب رویّے سے دیپو نے تنگ آ کر اس سے دُور ہی رہنا مناسب سمجھا تھا لیکن اس دوران وہ جیا کے قریب آ چکا تھا جو کالو کو اعلانِ جنگ کے لیے اُکساتا رہتا تھا!

تینوں نے ایک ساتھ پری میڈیکل میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کی تھی۔ قابلیت اور ٹسٹ کے مطابق جیا نمبر ایک پر تھی۔ دیپک نمبر دو اور کالو نمبر تین پر تھا۔ یہ جان کر کالو نے دیپو کو طنزاً کہا کہ ڈی سی کی بیٹی کو اوّل نمبر پر ہی ہونا تھا۔ مگر تمھیں جیا سے قربت کا فائدہ مل گیا ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے گندے خیالات کا اظہار کرتا منتخب فہرست میں جیا کا نام نہیں تھا جبکہ کالو اور دیپو کو ایم بی بی ایس میں داخلہ مل گیا تھا۔

دراصل جیا کالو کی مصنوعی معصومیت سے واقف نہیں تھی اس لیے ایک انقلابی سوچ کی لڑکی کالو سے پیار کرنے لگی تھی اس لیے اس نے قربانی دے کر کالو کو ایڈمیشن دلایا تھا اور اپنے باپ سے یہ کہہ بیٹھی تھی کہ وہ آئی اے ایس افسر بننا چاہتی تھی۔ یہ بات جب دیپو نے کالو کو بتائی تھی تب اس نے ایک فاتحانہ قہقہہ لگا کر کہا تھا آخر ضمیر کی آواز نے اُس کو بیدار کر دیا ورنہ عدالت کا فیصلہ افسر شاہی کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارتا اور اُس کی گونج سے مزے کی نیند ٹوٹ جاتی! یہ بات دیپو نے جیا کو اس لیے نہیں بتائی تھی کیوں کہ جیا نے اس سے اشارتاً یہ کہہ دیا تھا کہ وہ کالو کے ساتھ عمر گزارنا چاہتی ہے۔ کالو اور دیپو نے ایم ڈی بھی کر لی جبکہ جیا نے آئی اے ایس کر لیا۔ وہ دل و جان سے کالو سے پیار کرتی تھی مگر وہ دیپو سے کھل کر باتیں کیا کرتی تھی۔

اور ایک دن جب کالو یہ سمجھتا تھا کہ جیا دیپو کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے تب وہ یہ جان کر چونک پڑا کہ اپنے چیف سکریٹری باپ کی مرضی کے خلاف جیا نے ڈرامائی انداز میں کالو سے شادی کر لی۔ اور شادی کے فوراً بعد کالو نے جیا کو پہلا جھٹکا تب دیا جب اس نے جیا سے اپنے پھٹے جوتے پر پالش کرنے کا حکم دیا اور وہ بھی اس کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے جیا کے رشتے داروں اور اعلیٰ افسروں کے سامنے!

دوسرا جھٹکا تب دیا تھا جب گیسٹ ہاؤس میں اُس نے جیا کو نہ صرف کھانا پکانے، ٹیبل سجانے اور جھوٹے برتن صاف کرنے کے لیے کہا بلکہ اپنے دُور کے رشتے داروں کو اے سی کمروں میں بٹھا کر اپنی سہاگ رات اپنے گاؤں کے ایک فرسودہ مکان میں منائی تھی۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ اس نے ایک دُلہن کو اپنے گاؤں لے جانے کے لیے نہ جیپ کا استعمال کیا تھا اور نہ گھوڑوں کا، بلکہ اسی منحنی پگڈنڈی پر چلنے کے لیے مجبور کیا جس پر چل کر اس کی مرحومہ ماں سڑک بن جانے سے پہلے گیسٹ ہاؤس آیا جایا کرتی تھی۔ جیا نے اس اذیت ناک سفر کا ذکر صرف دیپو سے کیا تھا۔ دیپو نے جب کالو سے یہ پوچھا تھا کہ وہ ایسی نازیبا حرکتیں کیوں کر رہا ہے تب اُس نے کچھ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں سنا دی تھیں کہ دیپو اس دن کے بعد کالو کے سامنے کبھی نہیں آیا تھا۔ جب کالو کے باپ کی موت ہوئی تھی اُس دن وہ اپنے باپ کے ساتھ تعزیت کے لیے گیا تھا، تب اس کو کسی نے بتایا تھا کہ جیا وہاں موجود نہیں ہے۔

دیپو کو یہ معلوم تھا کہ جیا نے ایک لڑکی کو جنم دیا تو تھا مگر کالو اس کو دیکھنے کے لیے بھی نہیں گیا تھا۔ مگر اپنے باپ کے انتم سنسکار کے لیے اس نے جیا کو بُلایا تو تھا مگر پانچ سال الگ رہنے کے

بعد وہ تب کالو کے پاس نہیں آئی تھی۔

اس دن کے بعد وہ نہ کالو سے مل پایا تھا اور نہ جیا سے! وہ کالو کو مل بھی کیسے پاتا! وہ اچانک کسی دوسرے ملک چلا گیا تھا کسی کو کچھ بتائے بغیر!

کیونکہ جیا بھی نوکری چھوڑ کر کسی کو اپنے بارے میں کچھ بتائے بغیر گویا غائب ہوگئی تھی اس لیے کچھ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اسی نامعلوم شخص سے شادی کر کے اُسی کے ساتھ اُسی کی اولاد لے کر بدیش چلی گئی ہے۔ کچھ لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ اپنے والدین کے ایک ایئر کریش میں جان بحق ہونے کے بعد اپنی بیٹی کو بورڈنگ اسکول میں ڈال کر ایک جوگن بن گئی ہے لیکن بیشتر لوگ اس بات کی تصدیق کر رہے تھے کہ جیا کی بے وفائی اس روز عیاں اور بیاں ہوئی تھی جب وہ کالو کے اصرار پر بھی اس کے انتم سنسکار کے لیے نہیں آئی تھی اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ کالو جیا کی بیٹی کا باپ نہیں ہے!

کالو کی نظر میں جیا کی بیٹی کا باپ ڈاکٹر دیپک کول ہے مگر ڈاکٹر کول جیا کو ایک وفادار بیوی اور ایک پُرخلوص دوست سمجھتا ہے۔ یہ ایک دل ہلا دینے والا واقعہ ثابت ہوگا یہ کسی نے بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اس لیے کہ جس شخص سے کل تک ہر کوئی بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا آج ہال میں اس کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں اور وہ بھی اس کے ذاتی کردار پر۔ رسوا کن لہجے میں۔ ایک فریبی سمجھ کر اور ایک معصوم لڑکی کو ورغلا کر لے جانے کے حوالے سے۔ مگر ہیما کو ہال میں سراسیمگی کی حالت میں دیکھ کر کئی سوالات کے جوابات تو مل رہے تھے مگر یہ جان کر کہ وہ ملتجی نظروں سے سوالیہ نگاہوں کا جواب دے کر ایک ایمبولنس کیوں مانگ رہی ہے؟

ڈاکٹر دیپک کول نے ہیما کو غور سے دیکھا تو یوں لگا کہ پسینے سے شرابور ماتھے اور چہرے سے چپکے ہوئے اکھڑے اکھڑے بال ہیما کے نہیں بلکہ کالو کی ماں کے ہیں! دراصل ہیما اپنی دادی پر گئی ہے۔ یہ خیال جونہی ڈاکٹر کول کے ذہن میں اُبھرا تب اُس نے ہیما سے پوچھا۔ ''تم ڈاکٹر کالی داس کی بیٹی ہونا؟''

ہیما نے ہاں میں سر ہلایا تو ڈاکٹر کول نے سوالات کی بوچھاڑ کی۔ ''اگر تمھاری ماں کا نام جیا ہے تو کیا اس نے تمھیں یہ بتا دیا کہ تمھارا باپ کون ہے؟ اور اس کو کس نے بتایا کہ کالو ہی ڈاکٹر کے. داس ہے؟ اور وہ جو کسی سے نہیں ملتا تھا تم سے کیسے ملا؟ کیا جیا کو معلوم ہے کہ میں اسی میڈیکل کالج میں کام کرتا ہوں؟ اور اگر معلوم ہے تو تم نے مجھے میری محسن بہن سے کیوں نہیں ملایا۔ سٹوپڈ۔''

ہیما بے ساختہ رو پڑی اور روتے روتے فریاد کرنے لگی کہ اس کو ایک ایمبولنس فوراً دلا دو وہ

راستے میں سب کچھ بتادے گی۔

ایمبولنس چل پڑی تو ہیما سسک سسک کر بولتی رہی اور ڈاکٹر کول سنتا رہا۔ ''یہ جان کر کہ امریکہ سے ایک کرشماتی ڈاکٹر آیا ہے میں ان سے ملنا چاہتی تھی اس لیے نہیں کہ وہ میرے پتاجی ہو سکتے ہیں بلکہ اس لیے کہ میں ان کو اپنی ماں کی کیس ہسٹری بتاؤں اور یہ پوچھوں کہ کیا وہ ان کا آپریشن کر سکتے ہیں۔ چوکیدار انکل نے میری مدد کی اور جونہی ڈاکٹر کے.داس نے مجھے دیکھا تو ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ میری شکل اس کی ماں سے ملتی ہے پھر انھوں نے میرے تیار کردہ کیس شیٹ میں فالج ہونے کی تاریخ دیکھ لی اور بڑبڑانے لگے۔'ہاں! اس روز میرے پتاجی کا انتم سنسکار تھا' اور مجھے آٹو لانے کو کہا۔ اور ہم میرے گھر پہنچ گئے!

ماں کو دیکھ کر وہ رو پڑے کیونکہ ماں سن تو لیتی ہے۔ دیکھ بھی لیتی ہے مگر نہ بول سکتی ہے اور نہ چل پھر سکتی ہے۔ اسی لیے تو میں نے کرائے پر یہ فلیٹ لیا ہے۔ ماں جب بولتی تھی تب وہ مجھ سے یہی کہا کرتی تھی کہ اپنے باپ کی طرح ڈاکٹر بن جانا۔

ڈاکٹر کے.داس نے ماں کو بتا دیا کہ میری بیٹی میری ماں کا پُنر جنم ہے۔ بالکل وہی شکل و صورت! یہ سن کر ماں کی آنکھوں سے آنسو نکل گئے!

پھر ڈاکٹر کے.داس نے ایک بچے کی طرح بلک بلک کر کہا۔ ''جیا! میں تمھیں قدم قدم پر شکست دے کر فاتحانہ قہقہے لگاتا رہتا تھا۔ اب تم نے مجھے زبردست شکست دی ہے قہقہہ تو تم لگانا چاہو گی نہیں۔ کم از کم مسکرا تو دو!''

''مگر ایک بات غور سے سن لو۔ میں کل تمھارا آپریشن کر کے اپنی جیت پر قہقہے لگاؤں گا۔''

ڈاکٹر کول نے آہ بھر کر کہا ''گویا آج آپریشن ہوگا اور آج میں تمھارا انکل تمھارے پاپا کو اَسِسٹ کروں گا۔''

یہ سن کر ہیما چیخ کر رو پڑی۔

''انکل! ہم لوگ ممی کو نہیں پاپا کو لینے جا رہے ہیں۔''

''کیوں؟'' ڈاکٹر کول چونک پڑا۔

''آج پاپا ممی کا چیک اپ کر رہے تو ایک آہ بھر کر گر گئے۔ شاید ہارٹ اٹیک ہوا ہے!''

یہ کہہ کر وہ سسکتی رہی۔ ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح!

OO

آغا صاحب کا بنگلہ

ملک کے بٹوارے سے پہلے بزرگ لوگ شہر سے دُور جھیل کے کنارے پر واقع مغل باغات کی طرح اونچی فصیلوں کے درمیان دُور دُور تک پھیلے گلستاں اور دھان کے کھیتوں کی گود میں واقع آغا صاحب کے بنگلے کا لوگ یوں ذکر کیا کرتے تھے گویا وہ کسی طلسمی محل کا آنکھوں دیکھا حال بتایا کرتے ہوں۔

پھر حالات بدلتے رہے مگر کروڑوں کی آبادی والے برصغیر میں نہ سہی، ہمارے لاکھوں کی آبادی والے شہر میں شاید ہی کوئی گھر ہوگا، جہاں بنگلے کی تواریخ کے بارے میں تو نہیں، البتہ جغرافیے کے بارے میں باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی تجسّس کی خاطر اور کبھی کُرید کی خاطر!

کہا جاتا ہے کہ آغا صاحب ایک خاندانی رئیس تھے۔ لندن میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ان کی سوچ میں مغربیت تھی، دل میں مشرقیت کی بیلیں۔ ان کو اپنے آبائی شہر سے بہت پیار تھا اس لیے انھوں نے فنِ تعمیرات کے ماہر اپنے ایک انگریز دوست کی ذاتی نگرانی میں ایک ایسا بنگلہ بنوایا تھا جس کے بارے میں ان کو خود بھی معلوم نہ تھا کہ عمارت میں کتنے کمرے ہیں۔ کون سا دروازہ کھول کر چند سیڑھیاں چڑھ کر یا اُتر کر کس ہال میں پہنچا جاتا ہے۔ ان کا انگریز سکریٹری اُن کو بتا دیا کرتا تھا کہ ان کو کس سماجی، سیاسی، ثقافتی، موج مستی یا مذہبی جلسے میں مہمانِ خصوصی بن کر جانا ہے یا کسی مہمانِ خصوصی کو کس ہال یا کمرے میں ملنا ہے؟

آغا صاحب کو سنگیت سے بہت لگاؤ تھا اس لیے اکثر گئی رات تک گراموفون پر غزلیں سنا کرتے تھے۔ صرف اپنی بیوی کے پہلو میں بیٹھ کر، کبھی کبھی دلربا کو گود میں لے کر خود بھی گا لیا کرتے تھے۔ البتہ شکار کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا اور اکثر اپنے انگریز دوستوں کے ساتھ شکارگاہوں میں روپے پانی کی طرح بہایا کرتے تھے۔ اور ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اثاثے، گلیشیروں کی مانند پانی کے جھرنے بہاتے رہتے تھے گویا ایک سال کی آمدنی پانچ سال کے اخراجات برداشت

کرنے کے قابل تھے۔ ہاں وہ ضرورت مندوں کی دل کھول کر مدد کیا کرتے تھے۔ زکوٰۃ عطا کر کے یا چندے دے کر! حاسد لوگ کہا کرتے تھے کہ خدا نے نمک کا پہاڑ دیا ہے۔ کاٹتے رہو پھر بھی پہاڑ اقتصادی پاسبان بھی رہے گا اور حفاظت کے لیے سنتری بھی ہوگا۔ پشت در پشت! خود ایک غریب لڑکی سے شادی کر چکے تھے مگر جس اِکلوتی اولاد کو انھوں نے بورڈنگ اسکول میں ڈال کر مشکل سے لندن اسکول آف ایکنامکس پہنچایا تھا وہ ادھوری تعلیم کے بعد لندن میں پلی بڑھی ایک پری چہرہ ہم وطن کو بیاہ کر آغا صاحب کے بنگلے میں لے آیا تھا۔ عیش و عشرت کی بے خوف زندگی گزارنے کی خاطر! آغا صاحب کو اپنی بہو کی معیوب حرکتیں ناگوار گزرتی تھیں مگر چونکہ شوہر کو بے ہودگیوں میں ادائیں نظر آیا کرتی تھیں اس لیے آغا صاحب کی مغربی سوچ بھی اعتراضات کرنے کی بجائے اپنے مشرقی خیالات، جذبات بلکہ خدشات کو دل میں ہی دباتے رہے۔ پھر حاسدوں نے بد چلنی کے الزامات لگائے جبکہ گھر کے بے شمار نوکر چاکر یہ افواہیں پھیلاتے رہے کہ پری چہرہ عورت پر ایک جن عاشق ہو گیا ہے اور جب بھی وہ عریاں ہو کر کسی کونے میں دُبک کر بیٹھ جاتی ہے اس وقت جن اس کے ساتھ چمٹا ہوا ہوتا ہے۔ آغا صاحب کا بیٹا جب اچانک دو جڑواں بچوں کی پیدائش کے بعد بینک سے بہت بڑی رقم نکال کر فرار ہوا تب آغا صاحب کو ہر طرف سے خطرے کے سائرن سنائی دیا، تو انھوں نے لندن سے ایک ڈاکٹر کو بلایا تھا تاکہ وہ خفیہ طور پر یہ جان سکیں کہ اُن کے پوتوں میں ان کے بیٹے کا خون ہے یا نہیں، کیونکہ ان کو بھی بہو کے چال چلن پر شک ہونے لگا تھا۔

ڈاکٹر نے جانچ کرنے کے بعد آغا صاحب کو بتایا کہ ان کی بہو ایک قسم کے پاگل پن کی شکار ہے جس کو انگریزی میں سیزو فرینیا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ بیماری جینٹک یعنی ماں یا باپ کے خون کے ذریعے اپنا شکار تلاش کرتی ہے یا یہ پاگل پن، رنگ ڈھنگ، برتاؤ، عمل بدلتا ہے۔ کبھی بیمار اپنی سدھ بدھ کھو کر یا تو ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہتے ہیں یا پھر کسی کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور اس عمل کے دوران وہ نہ سوتے ہیں اور نہ کوئی اور کام کرتے ہیں۔ روکو ٹوکو تو حملہ بھی کر سکتے ہیں۔ کوئی چلنا چاہے تو وہ چلتا رہتا ہے۔ کوئی گانا پسند آئے تو دن رات وہی سنتے رہتے ہیں۔

بیماری لاعلاج ہے مگر دورے کا وقفہ کبھی کم ہو جاتا ہے اور کبھی اتنا لمبا کہ عمر کٹ جاتی ہے۔ دو اسٹروکس کے درمیان کبھی اتنا لمبا وقفہ ہوتا ہے کہ لگتا ہے بیمار ٹھیک ہو چکا، لیکن بیماری جاری رہتی

ہے۔ یہ خبر سن کر آغا صاحب، گر کر اٹھے نہیں تھے مگر سسر کی لاش دیکھ کر بہو چیخ پڑی اور ٹھیک ہو گئی تھی! اُس کا بڑا بیٹا پڑھائی میں اچھا تھا اس لیے اپنے دادا کا حوالہ دے کر لندن میں اُسی خاندان میں پہنچا جس کے ایک بزرگ نے اس کے دادا کا بنگلہ بنایا تھا۔ لندن اسکول آف اکنامکس چھوڑ کر ایک لڑکی سے اس قدر والہانہ پیار کر بیٹھا کہ اس کا دُم چھلا بن گیا اور ماں کو بھول ہی گیا۔ لڑکی تھی تو ایک خوبصورت صحافی مگر دماغ سے ایک شاطر سیاست داں۔ دونوں نے شادی کی اور سال میں ایک بار دونوں ماں سے ملنے کے بہانے اپنے حصے کی دولت لے کر اور بنگلے کی یادیں کیمرے میں قید کر کے چلے جایا کرتے تھے جبکہ دوسرا بیٹا اکثر اپنے دادا کے کمرے میں بیٹھ کر ان کے گراموفون پر، بہت ہی پرانے گیت سنتا رہتا تھا۔ کھانا پینا بھول کر، رات رات جاگ جاگ کر، باہر کی دنیا ہی سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو کر۔ بیس سال کی عمر ہوئی تو وہ دادا کی طرح رقص و سرور کی محفلیں سجاتا رہا مگر سونی بزم میں صرف سازندے اور رقاصہ ہوا کرتی تھی۔ پھر بند کمرے میں صرف رقاصہ اور وہ ہوتے تھے۔ ماں کو یہ جانکاری بھی نہیں ہوا کرتی تھی کہ بنگلے کے کس کمرے یا ہال میں کیا ہوا کرتا تھا۔ ہاں جب چھوٹے بیٹے نے ایک کتھک رقاصہ سے شادی کی اُس روز بڑے بیٹے اور بہو نے اُس کو ان کی شادی کی اطلاع دی تھی۔ اس خفیہ شادی سے ماں کو ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ ان کی سوئی ہوئی بیماری پھر سے جاگ اٹھی تھی جس کی وجہ سے ان کو ایک اذیت ناک رات گزارنی پڑی تھی۔ ماں نے بیٹے اور بہو کو سارے بنگلے میں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر وہ دونوں کہیں نظر نہ آئے تھے، آخر کار رات کے آخری پہر میں دونوں کو باغ کے کنارے ایسی حالت میں پایا تھا گویا فلم 'مغلِ اعظم' میں سلیم اور انارکلی محبت کا اقرار کر رہے ہوں۔ میاں بیوی خوش تھے۔ رقاصہ بیوی کو گانا گانے سے زیادہ اُس وقت خوشی ہوتی تھی جب اُس کی کلاکاری کو جنون کی حد تک پسند کرنے والا موجود ہو اور گانے کے بارے میں سوالات بھی کرے کہ یہ بھیروی راگ ہے نا؟ راگ مالکوس شام کو گائی جاتی ہے نا؟ دونوں ایک دوسرے سے والہانہ پیار کرتے تھے۔ کھانا لانے والے اور نوکر چاکر چلے جاتے تھے۔ کوئی یہ نہ جان پائے کہ میاں بیوی دونوں اٹھتے بیٹھتے سازوں اور راگوں کی باتیں کرتے ہیں بلکہ شوہر اکثر نواب واجد علی شاہ کی طرح کرشن کے رُوپ میں راس لیلائیں کرتا رہتا ہے۔ نہ کسی سے ملنا جلنا، نہ اخبار پڑھنا، نہ ٹی وی دیکھنا، یعنی دو نقطوں سے جڑی ایک لکیر! اور لکیر کے دو سِروں پر ایک تماشا اور دوسرا تماشائی۔ تماشہ رقص و سرود

کا۔ پھر ایک سال بعد بیٹے کی پیدائش نے لکیر کو ایک تکون بنا ڈالا۔ جس دن بیٹا پیدا ہوا اُسی روز اُس کی دادی کی موت ہوئی۔ یہ قہرِ خدا کیا ایک اتفاق تھا؟ وہ دن ایک بیوہ کے لیے جان لیوا کیوں ثابت ہوا؟ یہ ایک معمّہ ہو سکتا تھا اگر گھر کا ایک وفادار کاشتکار نئے منیجر کی من گھڑت کہانی کو ثبوت کے ساتھ خارج نہ کر دیتا۔

ہوا یوں تھا کہ بیوہ جو اَب آغا ہاؤس کی مالکن تھی، نے ایک اجنبی کو ایک پھلدار درخت کو بے دردی سے کاٹتے دیکھ کر جب اُس کو تھپڑ مارنا چاہا تب نئے منیجر نے اس کا ہاتھ روک کر کہہ دیا کہ اس کے بڑے بیٹے کی بیوی نے اُن لوگوں کو خیمہ لگانے کی اجازت دے دی ہے۔ پھر بہو نے پلٹ کر دیکھا تو کچھ پھلدار درخت کاٹے جا چکے تھے اور کچھ کاٹے جا رہے تھے، یہ دیکھ کر وہ چیخ پڑی تھی اور گر کر اس کی لاش ہی کو اٹھایا گیا تھا۔ انگریزن جٹھانی کے نمائندے نئے منیجر نے چھوٹی مالکن کو صدمے سے ہوئی اُس کی ساس کی موت کو خودکشی کا نام دے کر ورثے میں ملی بیماری سیزوپھرنیا کا ایک المناک نتیجہ بتا کر آغا صاحب کے چھوٹے پوتے کے انجام سے اس قدر ڈرا دیا کہ وہ اپنے بیٹے کے انجام سے بھی لرز اٹھی! شوہر کی حالت ایسی تھی کہ وہ بیوی کو گنگھرو باندھ کر رقص کا سلسلہ وہیں سے شروع کرنے کی ضد پر اَڑ کر چیختا چلاتا رہتا تھا۔ ماں کی گود سے بچے کو چھین کر وہ بیوی کو گھنگھرو پہنانے کے لیے مجبور کرتا رہتا تھا۔ دراصل اس پر بیماری کے اثرات کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا اور وہ کہاں جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے!—!!

اگر وہ ایک مشرقی خاتون نہ ہوتی تو بیٹے کو ساتھ لے کر بھاگ گئی ہوتی۔ مغربی عورت نے مشرقی عورت کو کئی بار یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ بنگلے کے اپنے حقوق اس کو دے کر پاگل شوہر کو کسی پاگل خانے میں ڈال کر بیٹے کو لے کر لندن میں باقی زندگی گزارے، مگر ایک وفادار بیوی بیمار شوہر کو چھوڑ کر جانے کے لیے ذہنی دباؤ کے باوجود آغا صاحب کا بنگلہ چھوڑنے کے لیے راضی نہیں ہوئی تھی۔ اور ایک پاگل کے وحشی پن کے باوجود لہولہان پیروں سے ناچتی رہی تھی۔ ناچتی رہی تھی۔

انگریزن بہو بنگلے کی مالکن بن گئی تھی اور دیورانی کو کہتی رہتی تھی کہ اپنا حصّہ اس کے نام کر دے۔ اس کے لیے نہایت شیریں زبان میں دباؤ ڈالنے میں جب ناکامیاب ہو کر اپنی حکمتِ عملی کے تحت واپس لندن آتی جاتی رہتی تھی، ہاں مگر ہر بار وہ اپنے چھوٹے دیور دیورانی اور ان کے بیٹے کی آرام دِہ زندگی کے پورے پورے انتظامات کرنے کے بعد جایا کرتی تھی حالانکہ وہ

جانتی تھی کہ ان کی زندگی ایک ہی بہت بڑے کمرے میں محدود تھی لیکن ان کو من چاہی سہولیات میسر کی جاتی تھیں۔ نہانے کے لیے گرم اور سرد پانی، روز کپڑے بدلنے کا پورا پورا انتظام، من پسند کھانے، میوے وغیرہ چھوٹے آغا صاحب کی بیوی یا ان کا بیٹا کمرے کے باہر رکھ کر دروازہ بند کر کے ایک وقفے کے بعد گویا حکم کی تعمیل کی جاتی تھی۔

دیورانی جٹھانی کی چال بازی سمجھ تو رہی تھی مگر شوہر کمرے کے باہر جانے نہ دیتا تھا۔ پھر وہ عذاب وہ وقت بھی آ گیا تھا جب شوہر کو سلانے کی خاطر دوائیوں کا استعمال کرنے کے بعد ہی بیوی کو گھنگھرو اُتار کر اپنے لہولہان پیروں پر مرہم لگانے کا وقت مل جایا کرتا تھا یا اپنے بیٹے کو سینے سے لگانے کا وقت مل جایا کرتا تھا۔ تب وہ سسک سسک کر ان دنوں کو یاد کیا کرتی تھی جب شوہر دورانِ رقص اپنی بیوی اور محبوبہ کی اُلجھی لٹ سلجھانے کے بہانے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا کر رومانی غزلیں سنایا کرتا تھا جبکہ اب جاگتے ہی یا ہوش میں آتے ہی اپنی نظریں گھنگھرو پر رکھ کر مسرت کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ گویا اس کو اپنا بیٹا بھی نظر نہیں آیا کرتا تھا بلکہ جب کبھی اس کی موجودگی کا احساس ہوا کرتا تھا تب وہ اُس کو اس کے ریاض میں خلل ڈالنے والی شے سمجھ کر کمرے سے نکال دیا کرتا تھا۔

پھر ماں بیٹے کو بنگلے کے ایک دوسرے سے جڑے بے شمار بھول بھلیوں میں پھنس جایا کرتی تھی ہر بار کوئی اجنبی اس کو اپنے کمرے کے اندر لے جایا کرتا تھا اور وہ بار بار اپنے بیٹے کو کمرے کے کسی کونے میں یوں دیکھا کرتی تھی گویا سجاوٹ کے لیے رکھی ایک پتھر کی مورتی! یوں وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کا بدبخت بیٹا بھی ورثے میں بیماری لے چکا ہے یعنی سیز وپھرنیا! کئی بار بیٹے کو لے کر فرار ہونے کے منصوبے بنا ڈالے جو کامیاب بھی ہو جاتے کیونکہ شہر والوں کے لیے آغا صاحب کا بنگلہ نہ تو قابلِ توجہ تھا اور نہ قابلِ غور تھا۔ مگر ایک مشرقی خاتون اپنے بیمار شوہر کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی؟ اور پھر جب وہ ٹیٹنس کی شکار ہو کر چل بسی تو بنگلہ اجنبیوں کے قبضے آ گیا۔ چونکہ دہشت کے عالم کو تقویت دینے کی خاطر یکے بعد دیگرے ہو رہے دھماکوں کی وجہ سے شہر میں کرفیو نافذ تھا اس لیے میت کو آغا صاحب کے بنگلے کے احاطے میں ہی دفن کیا گیا تھا۔ دفن کرتے وقت شوہر اجنبیوں کی طرح ایک تماشائی بن کر خاموش رہا تھا۔ کئی دنوں تک!

پھر ایک رات آغا صاحب کا چھوٹا پوتا چیختا چلاتا رہا اس لیے کہ بنگلے میں رہنے والوں نے اپنی سلامتی کے لیے پہلے بنگلے کو تاریکیوں کا پیرہن پہنانے کے لیے پہلے بنگلے کی ساری روشنی اپنے

قبضے میں کر لی تھی۔ یعنی جب جی چا با بنگلے میں مکمل بلیک آؤٹ اور اُسی رات دو گولیاں چلیں، ایک مرحوم آغا صاحب کے چھوٹے پوتے کی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے کے لیے اور دوسری مرحوم آغا صاحب کے پڑپوتے کو کرفیو کی خلاف ورزی کے لیے کیونکہ وہ بے تکے جوابات دے کر آغا صاحب کے بنگلے کی طرف دوڑ کر جانے لگا تھا۔

باپ اپنے دادا کے بنگلے میں گھس بیٹھے، جو بنگلے کے مالک تھے اور شہر میں بم کے دھما کے کرنے والے لوگوں کی گولی کا شکار بن گیا جبکہ بیٹا شہر میں امن بحال کرنے والوں کی گولی کا شکار بن گیا۔

بنگلے کے اندر جو ہوا وہ کوئی جان نہیں پایا اور بنگلے کے باہر کیا ہوا وہ بھی کوئی جان نہیں پایا! اور یوں پھر آغا صاحب کا بنگلہ نہ قارئین کے لیے نہ سامعین اور نہ ناظرین کی دلچسپی کا موضوع بن سکا! مگر وہاں بنگلے کے قابض اپنا مقصد پورا کرنے کی سعی کرتے رہے۔ مرحوم آغا صاحب کے بنگلے کی تواریخ کو مسخ کر کے، مگر جغرافیہ کا فائدہ لے کر!!

OO

عتاب

موت سے وہ ڈرتے ہیں جو اپنی خواہشات پوری کرنے کی خاطر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ مگر سوامی کی ایک ہی خواہش تھی کہ وہ آخری دم تک خدمتِ خلق کر کے ثواب کا کام کرتا رہے۔ اور اُس کی خواہش پوری ہو چکی تھی کیونکہ جب نگر پر بم گرا تھا تب وہ ایک کوڑھ کے مریض کی انگلیوں کی مالش کر رہا تھا۔ لیکن جب سوامی نے اُس کی بے چین روح سے پوچھا تھا کہ وہ اپنے نئے جنم میں کس جسم میں جانا پسند کرے گا تو اُس کا جواب سن کر سوامی کی روح پر عتاب ایک بجلی کی طرح کوند پڑا تھا! پھر جتنا غصہ اُس کو دنیا بنانے والے پر آیا تھا اُس سے کہیں زیادہ غصہ اُس کو اپنے آپ پر آیا تھا۔

دُنیا بنانے والے پر اس لیے کہ اُس کو ایک بم جیسے مہلک ہتھیار بنانے والے اپنے ہی بندوں میں شیطان کی جھلک کیوں نظر نہیں آئی تھی اور خود پر اس لیے کہ اُس کے آشرم میں اُس کے بہت ہی قریب رہنے والے ایک کوڑھ کے مریض کی دبی خواہش کے بارے میں وہ کیوں نہیں جان پایا تھا!

سوامی عبادت بھی کرتا رہا اور پرستش بھی کیا کرتا تھا تا کہ ہندو، مسلمان، عیسائی، بودھ، سکھ اور اَن گنت عقیدوں پر یقین رکھنے والوں کو اپنائیت کا احساس دلا سکے۔ وہ اِس سچ سے بے خبر نہیں تھا کہ موت کا دن معیّن ہے، یعنی جنم سے موت تک ہر جاندار کو سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے کسی سیڑھی پر رُک جانا ہے اور پھر اُس کی روح کو یہ جسم چھوڑ کر دوسرے جسم میں زندگی کا سفر جاری رکھنا ہے۔ دُنیا بھر میں کئی عقیدوں کے بارے میں جانکاری رکھنے والے سوامی نے اِس بار نہ مہا کال کو آتے ہوئے دیکھا تھا اور نہ ملک الموت کے قدموں کی آہٹ سُنی تھی! نہ کہیں کوئی ارتھی اٹھتے دیکھی تھی اور نہ کہیں کسی کو تابوت اٹھاتے ہوئے دیکھا تھا! نہ کہیں کوئی قبر دیکھی تھی اور نہ کہیں کوئی چتا! اور دیکھنا ممکن بھی تو نہیں تھا کیونکہ ایک ہی بم نے سبھی کو شعلوں کا کفن اوڑھ کر اُبل رہی زمین میں دفن کر دیا تھا!

سوامی کو یہ جانکاری تھی کہ اُس کے عقیدے کے مطابق ایسے حادثوں یا آفتوں میں اپنے اپنے جسم سے جدا ہوئے روح تب تک بھٹکتے رہتے ہیں جب تک ان کے اپنے سگے سمبندھی اپنے اپنے عقیدوں کے مطابق آتماؤں کی شانتی کے لیے مخصوص رسومات سرانجام نہیں دیتے۔

لیکن اس بار کوئی بندہ بچ گیا ہوتا تو وہ شرادھ یا گئودان وغیرہ کر لیتا نہ کہیں کوئی انسان زندہ تھا نہ حیوان! نہ پرندے تھے نہ کیڑے مکوڑے! آبی جانور بھی اُبل رہے پانی میں دم توڑ چکے تھے۔ ہاں مگر ہر مرنے والے کی روح خلا میں دنیا بنانے والے کے اگلے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی!

سوامی کے عقیدوں کے مطابق ایک 'کرم کانڈ' کے مطابق انسان کے بغیر سبھی جانداروں کو مکتی مل گئی تھی اور سبھی کو کسی دوسرے رُوپ میں جنم لینا تھا اور لاکھوں جسم چھوڑ کر انسان کا جسم پانے والوں کا فیصلہ ہونا تھا کہ کس کو نجات دی جائے گی، کون بھوت پریت بن جائے گا اور کس کو ایک نیا جسم مل جائے گا کیونکہ اُس کے عقیدے کے مطابق جیسے انسان کپڑے بدلتا ہے روح ایک جسم چھوڑ کر دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ یعنی ایک بُرے انسان کی روح ایک سانپ کا جسم پا لیتی ہے جبکہ ایک بچے کی حفاظت کرنے والا ایک سانپ ایک اچھے انسان کا جسم پا کر اُس بچے کا بھائی بھی ہو سکتا ہے۔ دونوں رام کے بیٹے لو اور کش بھی ہو سکتے ہیں۔ جبکہ سوامی کو نجات مل سکتی ہے۔ مہاپرشوں کی طرح یا گوتم بدھ کی طرح! وہ نجات ہی چاہتا تھا کیونکہ پھر سے انسان کا جنم لے کر اشرف المخلوق کی بے بس زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا! ایک دھرتی پر رہنے والے انسانوں کو زمین کی خاطر خون ریزی نہیں دیکھ پاتا! تیل کے کنوؤں کے لیے گھر والوں کو اُجڑتے، اکھڑتے نہیں دیکھ سکتا! اور اس سلسلے میں ایک ہی جھٹکے میں ایک ساتھ راکھ کا کفن اوڑھ کر اُبل رہی زمین میں جلتے ہوئے یا پھر دفن ہوئے اپنے بدبخت ہم نسلوں اور ہم عصروں سے ان کی رائے جاننا چاہتا تھا اس لیے کبھی کسی سے تبادلہ خیالات کیا کرتا تھا اور کبھی دھیان سے چرندوں پرندوں، کیڑوں اور مکوڑوں کی باتیں غور سے سنا کرتا تھا۔ خاص طور پر تب سے جب سے بم سے مرنے والوں کو قہرِ آدم کا شکار ہونے کی وجہ سے دنیا بنانے والے نے خاص رعایت دے کر ان کی روح کو ان کی مرضی کا جسم دینے کا یقین دلایا تھا۔ کبھی اُن کی باتیں سن کر رو پڑتا تھا اور کبھی ہنس پڑتا تھا لیکن آج وہ ایک ایسے شخص سے ملا تھا جس کو وہ بہت ہی اچھی طرح سے جانتا تھا بلکہ جس سے وہ بہت پیار کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک خطرناک بیماری کوڑھ کا شکار تھا اور اُس سے کئی برسوں سے علاج کروا رہا تھا بلکہ وہ اُسی کے ساتھ اُس کے آشرم میں ہی رہا کرتا تھا کیونکہ لوگ اُس کو دیکھتے ہی اپنا راستہ بدل دیا

کرتے تھے۔ اور وہ یوں اُس کا شاگرد بن گیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ جو لوگ اُس سے نفرت کیا کرتے تھے اور اُس کے مر جانے کی دعائیں مانگا کرتے تھے سب اُس کے ساتھ ہی فوت ہو گئے ہیں! وہ آفت کو اپنی بد دعا کا نتیجہ بتا رہا تھا لیکن جب اُس نے اپنی خواہش کا ذکر کیا تھا تب سوامی کی روح، اُس کی موت کے بعد بھی کانپ اٹھی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ چند لمحات پہلے اس نے چند چرندوں، پرندوں، مچھلیوں اور کیڑے مکوڑوں کی باتیں غور سے سن لی تھیں! حالانکہ اُن کا جسم اُن کی روح سے الگ ہو چکا تھا پھر بھی وہ اپنی مخصوص آواز میں مرنے کے بعد بھی انسانوں کی طرح بول کر، ایک ساتھ بیٹھ کر، خوب گھل مل جایا کرتے تھے!

شیر ایک ہرنی سے کہہ رہا تھا ''تم یہ نہیں جانتی ہو کہ جب میرے شکار یعنی تمھارے ہرن کو میری آنکھوں کے سامنے ایک اجگر نگل گیا تب اگر تم یا تمھارے بچے مل جاتے تو میں سب کو کھا کر سو گیا ہوتا! مگر چھوڑو ان بیتی باتوں کو۔ اور سنو! میں تمھارے جسم پر اور خاص طور پر آنکھوں پر دیوانوں کی طرح عاشق ہوں میں دنیا بنانے والے سے تمھارا جسم مانگ لوں گا۔''

ہرنی بولی ''تم بھی تو دل میں بٹھا لینے والی چیز ہو! تم راجا اور میں رانی! شیر کی ہرنی کو حفاظت ملے گی اور ہمارے بچے گھاس خور ہوں گے!''

شیر مسکرا کر رومانی انداز میں جواباً بولا: ''تم جانتی تو ہو کہ شیر بھوکا رہتا ہے مگر گھاس نہیں کھاتا۔ مگر بدلے حالات میں ہم دونوں کو عادتیں بدلنی ہوں گی ورنہ مجھ پر جو ہمارے بچے جائیں گے ان کی کھال اُتارنے کے لیے بندوق والے تعاقب کرتے رہیں گے اور تم پر جو ہمارے بیٹے ہوں گے شکاری اُن کے پیٹ میں کستوری کو پانے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے ایک کمزور کا ساتھی ایک طاقتور ہونا ضروری ہے۔''

پاس بیٹھا چوہا ایک دانشور کی طرح بولا ''یہ ٹھیک ہے! میں بلّی کو ڈرانے کے لیے کتے کا جسم کیوں نہ مانگ لوں؟ میں بلّی سے شادی کر لوں گا۔ بلّی کی شکل شیرنی سے ملتی ہے اور میرے دانت اور میری مونچھیں شیر جیسی ہیں!''

سبھی نے قہقہہ لگایا تو کتا بول پڑا ''امن سے رہنا ہے تو مجھ جیسے وفادار جانور کو چالاک لومڑی سے شادی کرنی پڑے گی۔''

''پھر میں ہاتھی سے شادی کر لوں گی۔ ایک طاقتور اور عقلمند کی جوڑی، واہ واہ کیا بات ہے۔'' چیونٹی رقص کرتے ہوئے بول پڑی۔

الو نے صدارت سنبھال کر کہا ''مشرق میں لوگ مجھے منحوسیت کی علامت سمجھتے ہیں اور مغرب میں مجھے خوش بختی کی علامت سمجھا جا رہا ہے! میں تو میں ہی ہوں۔ پھر اِدھر مارا گیا تو غدار کہلاؤں گا اور ادھر مارا گیا تو شہید کہلاؤں گا، کیوں؟ کیوں؟''

اس طرح وہ سبھی ایک دوسرے کی خامیوں کو نظر انداز کر کے خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی بھی انتقامی جذبے سے دنیا بنانے والے سے کسی اور کا جسم مانگنے کی بات نہیں کرے گا۔ یعنی ایک بار، ایک ساتھ اپنی مکمل بربادی دیکھ چکے یہ سب پر امن زندگی۔ نئی زندگی! بسر کرنے کی خاطر ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے جبکہ انسانوں کی بات ہی اور تھی۔

صدیوں پہلے ایک غلام نے ہاتھی کے مہاوت سے پوچھا ''میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔ جس ہاتھی نے میرے سر کو پتھر پر رکھ کر کچلا تھا اس کے مہاوت تم ہی تو تھے۔'' مہاوت نے کہا کہ میں نے ''بحیثیت ایک غلام کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ ورنہ سلطان میرا سر قلم کروا دیتا۔'' غلام نے طیش میں آ کر کہا۔ ایسی کتھائیں، حکایتیں، کہانیاں سنایا کرتا تھا جن کے مواد سے انسان کے اندر چھپا زہر یوں باہر آ جایا کرتا تھا جیسے کسی مریض کی بدبودار سانس۔ یعنی جذبۂ نفرت اُگل کر اُس کے چاہنے والے ہندو، مسلمان، بُدھ، سکھ، عیسائی، محبت کا جام پی کر اپنے انسان ہونے پر فخر محسوس کیا کرتے تھے۔ اپنے ایک مریض اور چاہنے والے سے اُس کو قطعاً ایسی توقع نہیں تھی جو اُس نے اپنی خواہش کے جواز میں کہا۔

''سوامی جی! ایک آپ تھے جس نے مجھ سے محبت کی۔ میرے اپنوں نے بھی مجھے میری بیماری کی وجہ سے کبھی چاہت کا احساس بھی نہیں دلایا۔ کاش آپ ایک مرد ہونے کی بجائے ایک عورت ہوتے۔ میں ایک عورت کے لمس کے لیے ترستا رہا۔ جب تک زندہ تھا۔ اب مر گیا ہوں مگر میری روح تڑپ رہی ہے۔ اگر مجھے دنیا بنانے والے نے نیا جنم دیا تو—''

''تو تم یہ کہہ دو گے کہ مجھے ایک صحت مند جسم دو'' سوامی نے ٹوک کر مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں! مجھے میرا اپنا ہی جیسا جسم چاہیے! وہی بیماری بھی ہو! اور پھر اس علاقے میں بھی بم گرائے جائیں۔ لیکن اِس بار پہلے کہرام مچ جائے تا کہ میں ایک لڑکی یا عورت اپنے کندھوں پر اٹھا کر اُس کو دنیا والوں سے دُور بہت دُور لے جاؤں! پھر وہی ہو، جو اِس بار ہوا تا کہ کوئی میرا پیچھا نہ کر سکے! جہاں میں پیدا ہو جاؤں۔ وہ بھی اسی طرح برباد ہوتا کہ پھر دنیا بنانے والا مجھ سے پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟''

وہ اپنی خواہشات کو خرافات کی چاشنی کے ساتھ ملا کر یوں سناتا رہا گویا وہ اپنے کرب کے لمحات کی تفصیلات سنا رہا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ جن ہاتھوں اور پاؤں سے بہہ رہی پیپ کو دیکھ کر لوگوں کو اُبکائیاں آیا کرتی تھیں اُن زخموں کو حسن کی ملکۂ عالم اپنی زبان سے چاٹ چاٹ کر ویسے ہی سکھا دیں جیسے حیوان ایک دوسرے کے زخموں کو سکھا دیتے ہیں۔

اچانک ایک آواز نے سوامی کو چونکا دیا "سوامی تم کو ایک بھلے انسان کا جسم دیا جاتا ہے۔"

سوامی چونک کر کوڑھی کی باتیں بھی سنتا رہا اور صدائیں بھی دیتا رہا۔

"نہیں، نہیں۔ جنم داتا! انسان بن کر نہ میں کسی معصوم پر کیا ہوا عذاب دیکھ سکتا ہوں اور نہ میری روح عتاب برداشت کر سکتی ہے! اور نہ میں صلیب پر چڑھ سکتا ہوں! نہ سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پی سکتا ہوں۔ کیونکہ شیطان اُس سے پہلے ہیروشما، ناگاساکی اور میرے نگر کی طرح میرے دوسرے گھر پر بھی آگ برسائے گا! جنم داتا مجھے کسی بیابان یا کھنڈر میں رہنے والا کیڑا یا مکوڑا بنا دو! ورنہ مجھے بھٹکنے دو تب تک جب تک تم نیا اوتار بن کر زمین پر نہیں اُتر جاتے!"

پھر سوامی کے شاگرد کے بغیر بھی آتماؤں نے انسان کا جسم ٹھکرا دیا۔ غالباً عتاب سے ڈر کر!!

OO

عجوبہ

وہ جو کبھی اسی شہر کے کسی بھی پارک میں یا چوڑی سڑک کے کنارے اپنا دنت منجن بیچنے سے پہلے اپنے اِرد گرد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی خاطر عشقیہ یا طلسمی کہانیاں سنایا کرتا تھا، آج تقریباً بارہ برس بعد نظر تو آیا تھا مگر ایک نئے رنگ میں! جس طریقے سے وہ ایک ٹوٹے پھوٹے زنگ آلودہ بائیسکوپ کے بارے میں بولتا جا رہا تھا کچھ لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ بائیسکوپ بھی کسی سیاسی پارٹی کا چناؤ نشان ہوگا، مگر بیشتر لوگ جو اُس کے اِرد گرد جمع ہو گئے تھے، وہ اس کو کوئی دیوانہ سمجھ کر اس کی دیوانوں سی باتیں نہایت دلچسپی سے سن رہے تھے۔

وہ ایک نیوز ریڈر کی طرح بار بار وہی باتیں سناتا رہتا تھا جو وہ کچھ دیر پہلے بتا چکا تھا۔ یعنی ایک ٹیپ بج کر ہر بار یہ سناتی تھی کہ یہ ایک عجوبہ ہے جو کرشماتی جواب دے کر ہر سوال پوچھنے والے کو چونکا دیتا ہے۔ تو سامعین و ناظرین! مہربان اور قدر دان!! قریب آ کر اس بائیسکوپ کے اندر جھانک کر دیکھئے تو! نہ آگرے کا تاج محل نظر آئے گا اور نہ باقی بچے چھ عجوبات کی تصویریں نظر آئیں گی! نہ دیوی دیوتاؤں کی رنگین تصویریں نظر آئیں گی نہ جنت یا جہنم میں جانے والے انسانوں کی خوشحالی یا بدحالی کی کوئی لبھانے والی یا ڈراؤنی جھلک نظر آئے گی! مگر ہاں سوال کو بڑبڑا کر کیا جائے، گھبراہٹ سے پیدا ہوئی لرزش سے پوچھا جائے یا حاتم طائی کی طرح بے خوف ہو کر پوچھا جائے تو اندر لگے شیشے میں ایک تصویر اُبھر کر آئے گی۔ اُس تصویر میں ہی تو سوالات کے جوابات پوشیدہ ہیں! ہاں!! جو یقین نہ آئے تو خود ہی آزما کر دیکھ لیجیے۔" جب لوگ بھاگنے لگے تھے تب وہ دیوانوں کی طرح چلاتا رہا۔ "سنو تو! دیکھو تو!!"

"سامعین و ناظرین! ذرا پلٹ کر میرے بائیسکوپ کو گھور گھور کر دیکھتے رہیے اور میری باتیں غور سے سنتے رہیے! ہاں یہ سچ ہے کہ میں ایک دیوانہ ہوں اور آپ کا سوچنا کہ دیوانہ تو دیوانگی کی ہی باتیں کر سکتا ہے، صحیح ہے مگر آپ میں جن قارئین کا مطالعہ وسیع ہے وہ ذرا یاد کر لیں کہ کہا جاتا ہے کہ مہاراجا وِکرماجیت کا تخت جس جگہ دبا ہوا ہے وہاں ایک خرافات بکنے والے ایک نیم پاگل کو

جب بٹھا دیا گیا تب وہ دانشوروں کی طرح باتیں کرنے لگا! یوں سمجھ لیجیے کہ میرے اس بائیسکوپ میں بھی ایسی ہی تاثیرِ رہنمائی ہے!

''صاحبان، مہربان اور قدردان! یہ بائیسکوپ ٹوٹا پھوٹا اور زنگ آلودہ کیوں ہے۔ میں آپ کو بتادوں گا۔ میں ایک کھنڈر میں اپنے ماضی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک کھنڈر میں مجھے اپنی معشوقہ منوہری ملی تو مجھے یاد آیا کہ دو پیار کرنے والوں کو جدا کروانے والوں پر کیسے قہر ٹوٹ پڑا تھا اور شہر موہن جوداڑو اور ہڑپا کے کھنڈروں میں بدل گئے!

''ایک اور کھنڈر جو ایشیا کی سب سے بڑی جھیل وُلر میں زیرِ آب ہے، مجھے اس کمہار کا گھر ملا تھا جس نے شہر کے لوگوں کو قبل از وقت اطلاع دی تھی کہ شہر ڈوب جانے والا ہے۔ بھاگ جاؤ ورنہ پانی کی چادر اوڑھ کر ابدی نیند سو جاؤ گے!

''اب ایک کھنڈر میں مجھے یہ بائیسکوپ ملا، تو یقین کیجیے میں نے اس کو ٹھوکر مار دی تھی، یہ سوچ کر کہ سینما، ٹی وی اور کمپیوٹروں کے زمانے میں دُور دراز کے پہاڑی علاقوں میں بڑے تو کیا بچے بھی بائیسکوپ کیوں دیکھیں گے مگر جب میں نے اِس کے اندر روشنی دیکھی تب میں گھبرا گیا۔ یہ سوچ کر کہ جیسے بچوں کو اُڑانے کے لیے آج کل کے شیطان بم رکھ دیتے ہیں شاید کسی نے کھنڈر اُڑانے کی خاطر بائیسکوپ میں بم رکھ دیا ہوتا کہ تواریخ کو بدلا جائے۔ سیاست کو فروغ دینے کی خاطر! ووٹ بینک کو متاثر کرنے کی خاطر یا پھر شیطانی آگ لگانے کی خاطر! میں تذبذب میں تھا اور پھر یہ سوچ کر کہ میں مر جاؤں لاکھوں بچ جائیں تو اچھا۔ میں نے بائیسکوپ کو اٹھا لیا۔ اندر ایک چھوٹا سا اسکرین دیکھا تو بڑبڑانے لگا۔ یہ کوئی طلسمی پیکر تو نہیں ہے۔ تب اسکرین پر ایک چہرہ اُبھر کر آیا جو سر ہلا کر 'نہیں نہیں' کا اشارہ دے رہا تھا۔

''دراصل یہ میرا ہی عکس تھا جو میں ایک اندر لگے آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے جب بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ سے سوالات کیے تو میں یہ دیکھ کر چونک پڑا کہ میں اپنے گھر میں ایک چمتکاری آلہ لایا ہوں جو ایک عجوبہ ہے۔

''سات رنگوں، ساتھ آسمانوں، سات سمندروں، سات عجوبوں کے بارے میں، میں نے سوالات کیے تو جوابات تصویروں کی شکل میں آنے لگے تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بائیسکوپ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ ورنہ میں اِس کو لے کر آپ کے سامنے کیوں پیش ہو جاتا! آیئے! قریب سے دیکھیے! جھانک کر اپنے اپنے سوالات پوچھیے! بلا جھجک پوچھیے! بڑبڑا کر پوچھیے، سرگوشیوں میں

پوچھئے یا چلا چلا کر پوچھئے! پھر جھانک کر دیکھئے۔ سامنے ایک تصویر نظر آئے گی۔ جو عیاں ہوگا اُس کو خود بیان میں بدل کر سن لیجیے! اس میں حیرت والی کون سی بات ہے؟ تصویر یا تصویریں اُبھر کر آتی ہیں یا نہیں۔ وہ آزما کر دیکھئے! واہ جناب کرشماتی طوطا آپ کی فال نکال دے وہ قابلِ بھروسہ ہے تو یہ تصویریں گمراہ کن کیسے ہو سکتی ہیں۔ ہاں۔ مایوس کن ہو سکتی ہیں! کوئی پوچھ بیٹھے کہ کیا میں خاقان بن سکتا ہوں تو جواب میں اسکندر اعظم کا خالی ہاتھ اپنے آخری سفر پر جانے کی تصویر کے ساتھ آجائے؟ مطلب یہ کہ جب ارسطو جیسے استاد کے ہوتے ہوئے دنیا پر حکومت کرنے کی حسرت لے کر خالی ہاتھ اس دنیا سے ہی چل پڑا تھا اسکندر تو تم؟ خود ہی سمجھنے والی بات ہے نا؟ ایک عقیدت کو ماننے والے لوگ ایک پراچین مگر متبرک کتاب 'برہست کتھا' کو سامنے رکھ کر پہلے اس تصویروں والی کتاب کی پرستش کرتے ہیں پھر من میں سوال کرتے ہوئے کتاب کا ایک ورق پلٹ دیتے ہیں۔ ایک تصویر سامنے آتی ہے اور سوال کا جواب عیاں ہو گیا۔ تصویر میں ایک رانی شان و شوکت سے جلوہ گر تھی۔ اِرد گرد کئی ساز بجا رہی حسینائیں اور رقص کر رہی رقاصائیں۔ مگر رانی کے پاؤں میں سونے کی زنجیریں۔

"اُس عورت کو اس کے دولت مند شوہر نے بیوی کے حقوق سے محروم کر دیا تھا مگر پھر بھی وہ گھر کی مالکن تھی! اچھا اگر آپ لوگ ایسے سلسلے کو بے ہودہ کہہ کر نا منظور کر رہے ہو تو پیشین گوئیاں کرنے والے ناسٹرڈائس کی بات کرو نا؟ وہ مستقبل میں ہونے والے حالات، واقعات، حادثات اور سانحات اپنے سامنے رکھے ہوئے ایک بہت بڑے منہ والے برتن میں موجود پانی میں عکس دیکھ کر کیا کرتا تھا اور اپنی بہت ساری پیشین گوئیوں کو امر کر دیا کرتا تھا۔ جن میں بیشتر صحیح ثابت ہو کر دنیا کو چونکا دینے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ ٹھیک ہے جن کو میرے اس عجوبے سے سوال پوچھنا ہیں وہ ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ میں ایک ایک کر کے آپ کو بلاؤں گا۔

"ایک گول چھوٹی سی کھڑکی سے سوال پوچھنے والا یا پوچھنے والی جھانک کر دیکھ لے اور دوسری گول کھڑکی سے میں دیکھتا رہوں گا۔ اور تصویروں کا مفہوم سمجھایا کروں گا۔ اچھا میں آپ سب کو اپنے بائیسکوپ کی خوبیاں اور خامیاں بتا دینا چاہوں گا۔ پہلے غور سے خوبیوں کے بارے میں بتا دوں:

(۱) یہ جھوٹ نہیں بولتا۔

(۲) یہ چار نام سمجھ سکتا ہے۔ یعنی بھگوان، انسان، حیوان اور شیطان۔ انسان اور حیوان کو وہ اچھایا

بُرا سمجھتا ہے۔ آپ اگر ہندو یا مسلمان، برہمن یا ہریجن کے حوالے دے کر سوال پوچھیں تو جواب نہیں دے گا بلکہ جواب آیا بھی تو یا تو ڈھول نظر آئے گی یا دُھواں!

(۳) سوال غیر مناسب ہو، غیر اخلاقی ہو یا کسی سازش کا حصہ ہو تو اسکرین کا رنگ لال ہو جائے گا اور وہ روٹھ کر جواب دینا بند کر دے گا۔

اور میرے بائیسکوپ کی خامیوں کے بارے میں بھی بتا دینا چاہوں گا:

(۱) میرا بائیسکوپ آپ کو ماضی کے بارے میں یا پھر مستقبل کے بارے میں بتا سکتا ہے۔ حال کے بارے میں نہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حال میں حالت بدحال ہے۔

(۲) میرا بائیسکوپ ایک ایسا عجوبہ ہے جو پتھر کے زمانے سے تا حال تمام لڑائیوں کے بارے میں، طاقتور فاتحوں کے بارے میں کچھ بتانے کی بجائے جنگ میں مارے گئے لوگوں کے بارے میں بتا دے گا۔ ظلم ظالم اور مظلوم کے بارے میں دردناک مناظر دکھا سکتا ہے۔ آپ رامائن کے بارے میں پوچھیں یا مہابھارت کے بارے میں پوچھیں، تب بھی۔ دیوی دیوتاؤں کی راکھشسوں کے قہر آلود یدھ کے بارے میں پوچھیں یا آج کل کے حکمرانوں اور دہشت گردوں کے ہو رہے گوریلا جنگ کے بارے میں پوچھیں! کالنگا کی لڑائی کے بارے میں پوچھیں یا واٹرلو کی جنگ کے بارے میں پوچھیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے بارے میں پوچھیں یا دوسری جنگِ عظیم کے بارے میں پوچھیں۔ کارگل جنگ کے بارے میں پوچھیں یا عراق پر ہوئی بمباری کے بارے میں پوچھیں۔ پارلیمنٹ پر ہوئے دہشت گردوں کے بارے میں پوچھیں یا کسی فرقہ وارانہ فساد کے بارے میں پوچھیں۔ راجا پرتھوی راج چوہان اور سنجوگتا کے عشق کی داستان کے بارے میں پوچھیں یا سلطان یوسف چک اور شاعرہ حبہ خاتون کی محبت کی داستان کے بارے میں پوچھ لیں۔

یہ رہی ماضی کی باتیں۔ اور مستقبل کے بارے میں وہ صرف ہونے والی تباہی اور بربادی کے بارے میں بتائے گا تا کہ سوال پوچھنے والے اپنے انجام سے باخبر ہو کر چنگاریوں کو انگارے یا شعلے بن جانے سے پہلے ہی بجھا دینے کی سعی کریں۔ چنگاریاں اقتصادی بحران سے پیدا ہوں۔ سرحدوں کی رسہ کشی سے پیدا ہوں، ہوس اور حرص سے پیدا ہوں، گندی سیاست یا فرقہ پرستی کے ٹکراؤ سے پیدا ہوں یا غیر ملکی مداخلت سے پیدا ہوں۔"

بائیسکوپ والا آنکھیں بند کر کے بولتا رہا۔ گویا وہ یہ تمام سوال بائیسکوپ سے پوچھ چکا تھا اور اب یاد کر کے بول رہا تھا تا کہ سوال پوچھنے والے سوچ سمجھ کر ہی سوال پوچھ کر معقول سوچ و سمجھ

کی مدد سے کوئی قدم اٹھا سکیں۔

جب اس نے آنکھیں بند کی تھیں تب اس کے سامنے ایک لمبی قطار تھی لیکن جب اس نے ایک بار کہتے کہتے آنکھیں کھول دیں تب ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کو دیکھ کر اُس نے ہونٹ سی لیے اور بائیسکوپ اٹھا کر اپنے گھر چل پڑا۔

گئی رات ایک دوسرے سے جنون کی حد تک عشق کرنے والے بائیسکوپ والے کے گھر پہنچ گئے۔ اور یہ جان کر بے حد دُکھی ہوئے کہ ایک دیوانہ ایک بہت ہی کار آمد عجوبے کو اگلی صبح زمین میں ایک لاش کی طرح دفن کرنا چاہتا تھا، ایک ٹائم کیپسول کی طرح زمین کی نچلی تہوں میں دبانا چاہتا تھا۔ محبت کرنے والوں کے دل ایک جیسے تھے، سوچ وسمجھ ایک جیسی تھی، قول اور عمل ایک جیسے تھے اور ان کا پیار اتفاقاً نہیں ہوا تھا۔ چاہت کا جذبہ محبت میں بدل گیا تھا۔ پھر عشق نے اپنی مہک سے دونوں کی زندگی کو معطر کر دیا تھا اور پھر جنون نے لیلیٰ مجنوں بن جانے کی بجائے دونوں کو ایک چھت کے نیچے میاں بیوی بن کر زندگی گزارنے کی خواہش کو جنم دیا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ دونوں کا مذہب جدا ہے۔ ایک ہندو، ایک مسلمان۔ دونوں اپنے عقیدوں سے پیار کرنے والے مگر اپنے اپنے مذہب کا احترام کرتے ہوئے دونوں شادی کرنا چاہتے تھے اور بائیسکوپ سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوال پوچھنا چاہتے تھے۔ دیوانے نے کہا کہ بہت ساری شادیاں ہو چکی ہیں اس لیے ڈرنے کی کون سی بات ہے؟

دونوں خوش ہوئے کیونکہ ایک انسان تو مل گیا تھا جو اُن کی مدد کرنے کے لیے تیار تھا خاص طور پر جب دیوانے نے ایک ہندو ڈاکٹر کی ایک مسلمان ڈاکٹر کے ساتھ کی گئی شادی کو کامیاب بتایا تھا۔

اچانک جب دونوں نے بائیسکوپ سے سوال کیا تو اس نے سینکڑوں مثالیں دے کر دونوں پیار کرنے والوں کا حوصلہ بڑھایا۔ فلمی دنیا کی مثالیں، سیاست دانوں کی مثالیں، سنگیت کاروں کی مثالیں، راجوں اور مہاراجوں کی مثالیں، کھلاڑیوں کی مثالیں۔

اچانک دیوانے نے دونوں سے پوچھا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ دونوں نے بتایا کہ وہ ایک سرکاری سپر بازار میں کام کرتے ہیں اور دونوں کی تنخواہ جوڑ کر ایک پرسکون زندگی گزارنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ تب دیوانے نے اپنے بائیسکوپ سے پوچھا کہ دونوں کا مستقبل کیا ہے؟ تو بائیسکوپ نے جو تصویر اب دکھائی اس سے تینوں خوف زدہ ہو گئے۔ دیوانے نے آہ بھر کر دونوں

سے کہا: ’’یہ رعایت صرف امیروں اور اونچی سوسائٹی والوں کے لیے ہے۔ غریبوں کے لیے نہیں! بھول جاؤ ایک دوسرے کو! کہیں میرے عجوبے کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی تو سارے ملک میں ایک خطرناک تحریک شروع ہو جائے گی! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ شادی کسی سیاسی پارٹی کے مینی فیسٹو کا پہلا حصّہ بن جائے اور دیکھا دیکھی میں مخالف پارٹی والے بھی اس کو ایک اہم نقطہ بنا سکتے ہیں۔ ہاں اگر تم امیر ہوتے، رسوخ والے ہوتے یا پھر مشہور و معروف ہوتے تو تمھاری شادی بھی اروِنا اور آصف علی کی ایک مثالی شادی کہلاتی! سنیل دت اور نرگس کی کامیابی شادی کہلاتی! غریبوں کی شادی سماجی کم اور سیاسی مسئلہ زیادہ بنایا جاتا ہے، لڑکی پر الزامات لگائے جاتے ہیں۔ یعنی اپنی خوبصورتی کو متاع کوچہ و بازار بنا کر ایک گاہک کو لبھاتی آئی ہے اور اب اس گاہک کو اجگر کی طرح نگل کر شادی کا نام دینا چاہتی ہے چڑیل! یا پھر؟ لڑکے کو بھی کوئی نہیں بخش دیتا ہے۔ یعنی آج جس پھول کو گلے سے لگانے کی بات کر رہا ہے، اُس کو کچل کر کسی نالے میں پھینک دے گا۔ نالی میں گرے ہوئے پھول کو نہ پوجا کی تھالی میں رکھا جاتا ہے اور نہ ارتھی پر رکھا جاتا ہے۔ یعنی نہ کوئی قدردان ملتا ہے اور نہ کوئی خریدار ہے۔ اور یہ شادی ایک سازش ہے! پھر شروع ہو جاتا ہے ایک سنگرام یعنی ایک سیاسی جنگ! فسادات کی شروعات کے بعد قتلِ عام! مرنے والے انسانوں میں ہندو بھی ہوتے ہیں اور مسلمان بھی! یہ شادی نہیں بربادی کا ایک اور باب ہوگا۔‘‘

دیوانہ یوں کہتا رہا جیسے وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی تصویروں کو الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔ اُس کی آواز میں لرزش تھی اور وہ اپنے لب سی لینا چاہتا تھا مگر کرب کی شدت سے پھر لب تھرتھرائے تھے اور اس کے ارادوں کے ٹانکے ٹوٹ چکے تھے ورنہ وہ شاید ہر سطر کہہ کر خاموش ہوا ہوتا!

آخری بار بائیسکوپ کو دیکھ کر دیوانے کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور دو پیار کرنے والے، پیار و محبت سے زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے والے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بائیسکوپ کو یوں دیکھتے رہے گویا وہ ایک عجوبہ نہیں بلکہ ایک عام انسان کی طرح ایک الیکشن سے پہلے ایک بیلیٹ بکس کو دیکھتے رہتے ہیں!

○○

پسِ پردہ

میرے قدم تھم گئے ہیں اور لگتا ہے جیسے میرے پاؤں جم گئے ہیں۔ اور میں ایک خیالاتی اور جذباتی کشمکش کا شکار ہو چکا ہوں! کیونکہ میں نے قیامت دیکھ لی ہے اور حشر بھی دیکھ چکا ہوں!
یہ دونوں منظر میں کسی مصور کے تصور کی مدد سے کسی آرٹ گیلری میں نہیں بلکہ اپنے بچپن کے دوست راج کمار کے ہال نما ڈرائنگ روم میں دیکھ چکا ہوں! بلکہ سرسوتی کی باتیں سن کر اندھے اعتقاد اور کھوکھلے اعتماد کا برابری کا مقابلہ بھی دیکھ چکا ہوں! اور اِس رنگ برنگی دنیا کے وہ رنگ دیکھ چکا ہوں جو بناوٹی رنگوں کی رنگت میں اپنا وجود کھو بیٹھے ہیں۔ اس لیے یہ سمجھ نہیں پارہا ہوں کہ کس کو مجرم سمجھوں اور کس کو مظلوم کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں!
جبھی تو میں ذہنی کشمکش کا بھی شکار ہو چکا ہوں! کوئی بتائے کہ میں کیا کروں؟
جب میں یہاں آیا تھا تب یہ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مجھے مشکل پاؤں رکھنے کی جگہ ملی تھی۔ ہر چہرے پر تذبذب اور غصّے کے ملے جلے تاثرات تھے۔ مجھے یہ خبر دی گئی تھی کہ راج کمار پاگل ہوگیا ہے لیکن یہاں آ کر پتہ چلا کہ محلے کی عورتیں اُس کی بیوی رانی کے بارے میں زیادہ فکرمند تھیں کیونکہ وہ اپنے شوہر کے عتاب کا شکار ہو چکی تھی وہ اس لیے کہ ایک ذمّے دار ماں نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے رکھے ہوئے روپے اپنے خود پرست، عیاش اور بچپن سے ہی بگڑے ہوئے شہزادے کو قطعاً نہ دینے کا عزم کیا تھا۔ اگر چند سمجھ دار آدمی راج کمار کے اِرد گرد نہ بیٹھے ہوتے تو رانی کی چند جنونی مداح عورتوں نے راج کمار کو ڈھونگ رچانے کی خاطر پیٹ پیٹ کر مار ڈالا ہوتا!
یہ بات مجھے خفیہ طور پر میری بیوی نے بتائی تھی کہ رانی نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی تھی کہ میرے پاگل شوہر کے پھینکے ہوئے پتھر کا جواب پھولوں سے دیا جانا چاہیے! مگر وہ پل دو پل کے لیے جب بھی ہوش میں آجاتی تب اصرار کرتی تھی کہ راج کمار کو پاگل خانے بھیج دو! شاید ایسا ہوا ہوتا مگر راج کمار کی بیٹی ہیما نے گویا ایک گلیشیر پر ایک بجلی گرا کر ایک شانت ندی میں اتنا گرم پانی ڈالا تھا کہ ندی کے کنارے بیٹھی ہوئی عورتیں سیلاب سے کٹ رہے کنارے دیکھ کر اس قدر گھبرا گئی تھیں کہ

دروازے کے بغیر ان کو اپنے بچاؤ کا کوئی اور راستہ نظر ہی نہیں آیا!

رانی جس کو محلے والے احتراماً سدھ لکشمی اور درگا بھگوتی کے القاب سے نوازاتے تھے ایک تازہ کاٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر پڑی تھی مگر ایسا لگ نہیں رہا تھا کہ اُس پر حملہ ہوا ہوگا! اس لیے اُس کی حالت قابلِ توجہ تھی مگر راج کمار کی حالت قابلِ غور تھی کیونکہ اُس کا چہرہ لہولہان تھا اور کپڑے تار تار ہو چکے تھے! یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اُس نے یہ وحشی پن خود کیا ہے۔ چونکہ مجھے دیکھ کر اُس نے جب حسبِ عادت نظریں جھکائی تھیں تو وہ اپنے آنسو روک نہیں پایا تھا وہ اپنے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں پر قابو پا کر مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا میری بیوی نے مجھے بآوازِ بلند یہ کہا تھا کہ راج کمار قابلِ ترس نہیں ہے بلکہ یہ وہ باپ ہے جو اپنی بیٹی کی شادی کے لیے دادا کی رکھی ہوئی رقم اپنی بیوی سے مانگ رہا ہے! وہ بھی اپنی عیاشی کے لیے!

خود پرستی اگر جنون بن جائے تو انسان پاگل ہو جاتا ہے۔

دوسری عورتوں نے میری بیوی سے ہاں میں ہاں ملا کر گویا راج کمار کے خلاف ایک جہاد کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ سن کر رانی آہیں بھر کر بڑبڑا رہی تھی۔ ہیما کا کیا ہوگا؟ دس دن بعد شادی ہونی ہے! اب میں شادی کی تیاریاں کروں یا اپنے پاگل پتی کا علاج کرواؤں؟ میں کیا کروں؟ سہاگ کی فکر کروں یا اولاد کے لیے کچھ کر پاؤں؟

رانی کی اس لاچاری کا حل کسی کے پاس نہ تھا۔ مگر سرسوتی جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ موجود نظر آتی تھی اپنے مخصوص حل کے ساتھ حاضر تھی۔ رانی کی آہ کے ساتھ سرسوتی کے ہونٹ ہلنے لگے اور وہ بڑبڑا کر کہنے لگی۔ 'ایک لمبے سینگوں والے بھیڑ کی بلی دے کر اپنے بُرے گرہوں کو پسپا کر دو۔ سہاگ کی رکھشا بھی ہوگی اور دیکھ لینا وہی کنیادان بھی کریں گے۔ ستارے گردش میں ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

''اگر میں بھی اپنے بُرے گرہوں کو خوش رکھنے کے لیے بلی دے سکتی تو کب کی ٹھیک ہوئی ہوتی۔'' یہ جملہ اُس کا تکیہ کلام بن گیا ہے اس لیے جو بھی سنتا ہے وہ ہنس پڑتا ہے یا پھر غصّے سے اس کو ٹوکا کرتا ہے۔ سرسوتی مجھ سے بھی یہی کہا کرتی تھی جب میں اُس کو نمک کم کھانے اور آرام کرنے کی تاکید کیا کرتا تھا۔

آج بھی میں اُس کا بہت زیادہ بلڈ پریشر دیکھ کر گھبرا کر یہی مشورہ دے رہا تھا۔ اور اُس کو یہاں دیکھ کر حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔ لیکن اس وقت میری نگاہیں راج کمار پر جمی ہوئی ہیں۔

راج کمار میرے بچپن کا دوست ہے۔ ہم عمر اور ہمراز بھی! وہ میرا محسن بھی ہے، وہ میری مدد

نہ کرتا تو میں ایک چپراسی کا بیٹا، ذہین ہوتے ہوئے بھی میٹرک پاس کرنے کے بعد کسی دفتر میں کلرک ہوتا یا پھر کسی اسکول کا ماسٹر ہوتا! ایک ڈاکٹر نہیں!!

راج کمار کو جب ہم سب محلے کے بچّے دیکھا کرتے تھے تب ہم احساسِ کمتری کی وجہ سے اُس کے قریب جانے کی بجائے بھاگ جایا کرتے تھے۔ دراصل اُس کے کپڑے، جوتے، ٹوپیاں، کھلونے وغیرہ دیکھ کر ہمیں بچپن میں ہی اپنی غریبی کا احساس ہوا تھا۔ اِس لیے ہم اُس سے دُور دُور رہا کرتے تھے۔ مگر خوش قسمتی سے میں ایک بگڑے شہزادے کا دوست بن گیا تھا جس کی وجہ سے میرا اُس کے گھر میں آنا جانا نصیب ہوا تھا۔ پھر حالات ایسے بن گئے کہ میں ان کے گھر میں ہی رہنے لگا تھا۔

یوں تو مجھے راج کمار کے باپ ٹھیکیدار ہری رام شرما نے اپنے بیٹے کے ایک نوکر کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا مگر راج کمار سے قربت کی وجہ سے مجھے گھر میں کھانا ملا کرتا تھا۔ کاغذ قلم، کتابوں کے علاوہ اس گھر میں پڑھانے والا ایک غریب پرور استاد ملا تھا جو یہ جانتا تھا کہ اُس کو راج کمار کو پڑھانے کے لیے ٹھیکیدار منہ مانگی رقم دیتا ہے۔ اُسی کی ذاتی دلچسپی سے میں نے میٹرک میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی اور پھر راج کمار کی ہی مالی مدد سے میں ڈاکٹر بن گیا ہوں۔ سرسوتی مجھے آج بھی یقین دلاتی رہتی ہے کہ میرے گرہ اچھے ہیں اس لیے وہ راج کمار کے گرہوں پر حاوی ہو کر اُس کو مدد کرنے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ وہ میری مدد کیوں کیا کرتا تھا۔ دراصل نہ میں ایک چالاک لڑکا تھا اور نہ راج کمار اُتنا بے وقوف تھا جس کی احمقانہ حرکتوں کا میں ناجائز فائدہ اٹھایا کرتا تھا۔ راج کمار کو معلوم تھا کہ اُس کا باپ اُس کی بے ہودہ حرکتوں کو کسی حد تک برداشت کر سکتا ہے اس لیے باپ کی توجہ ہٹانے کے لیے اکثر بے ہوش ہو جانے کا سوانگ رچا کر اس کو اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنے کی عادت جو پڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر جب بار بار یہ احساس دلاتے تھے کہ راج کمار کو کوئی بیماری نہیں ہے تو سرسوتی ہری رام کو تاروں کی گردش یا گرہوں کے چکّر کے حوالے دے کر پاٹھ پوجن، ہَوَن یا دان پونیہ کرنے کی صلاح دیا کرتی تھی اور پھر جب راج کمار چھ دن کے بعد کھانا کھا لیا کرتا تھا تب باپ بیٹے کی ہر فرمائش پوری کیا کرتا تھا، غلطیاں کرنے کی سزا نہیں دیا کرتا تھا اور یوں اُس کو عیش کرنے کا چسکہ لگ گیا تھا!—!!

راج کمار چھ دن تک بھوکا کیسے رہتا تھا یہ صرف میں جانتا تھا کیونکہ میں ہی تو اس کو موقع پاتے ہی بسکٹ، مٹھائیاں یا کیک وغیرہ کھلایا کرتا تھا۔ یعنی اس کی قیامت خیز ڈرامے بازی پر پردہ ڈال کر میں اُس کے خرچے پر خود بھی عیش کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ میں ہی تو اُس کے اسکول کا

کام کیا کرتا تھا۔ وہ فیل ہو جایا کرتا تھا تو وہ بے ہوشی کا ڈرامہ کر کے اپنے باپ کو اسکول والوں کو اگلی جماعت میں پروموٹ کرنے کے لیے مجبور کیا کرتا تھا۔ لیکن دسویں میں بار بار فیل ہوتا رہا!

ایک بار اُس نے اپنے باپ کے ضروری کاغذات چُرا لیے اور ہم کاغذ کی کشتیاں بنا کر ان کو دریا میں بہا کر جب خوشی سے جھوم رہے تھے تب کسی نے یہ کہہ دیا کہ آج ہری رام ٹھیکیدار خون کے آنسو روئے گا یا پھر اپنے لاڈلے کو رُلائے گا! یہ سن کر راج کمار نے اپنے آپ کو پانی میں یوں گرا دیا تھا جیسے کسی جن یا بھوت نے اس کو اپنے بس میں کر لیا تھا۔ یہ سب اُس نے اتنی خوبی سے کیا تھا کہ اگر وہ آنکھ مار کر اشارہ نہ کرتا تو شاید میں بھی خوف زدہ ہو گیا ہوتا!

راج کمار کے دماغ میں موقع کی نزاکت دیکھ کر فوراً اپنے بچاؤ کے لیے کوئی ڈراؤنا ڈراما جنم لیا کرتا تھا کیونکہ وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنے باپ کو جذباتی طور پر بلیک میل کر کے ایک تو اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالا کرتا تھا اور پھر کچھ نہ کچھ بطور بونس لیا کرتا تھا اس لیے وہ شاید کسی اور چیز کے بارے میں سوچتا ہی نہیں تھا۔ کبھی سیڑھیوں پر چیخ مار کر گر کر یا محلے کی کسی گلی کوچے، سڑک پر یا کلاس میں بے ہوشی کا ڈراما کر کے یہ احساس دلاتا کہ اُس کو غیبی طاقت اپنا شکار بنا رہی ہے! یہ اُس نے سرسوتی کی باتیں سن کر جان لیا تھا اور اُس بار بھی سرسوتی نے گرہوں کا چکر بتا کر ہری رام کو اس بات پر راضی کیا تھا کہ برے گرہ وہ راکھشس ہوتے ہیں جن کو ڈاکٹروں یا طبیبوں کی دوائیاں بھگا نہیں سکتی ہیں بلکہ اُن کو یا تو عبادت یا پرستش روک سکتی ہے یا پھر کچھ دے کر بھگایا جا سکتا ہے۔ اُس بار راج کمار کی حالت چھ دن کے بعد بھی سدھر نہ پائی تھی اس لیے سرسوتی نے ہری رام کو ایک لمبے سینگوں والے بھیڑ کو قربان کر کے اپنے لاڈلے بیٹے کو ہوش میں لانے کا حل یعنی بُرے گرہوں کو بھگانے کا آخری نسخہ بتایا تو باپ نے ایک ساتھ گیارہ بھیڑوں کی قربانی دی تھی اور پرشاد سارے محلے کو دیا تھا۔ راج کمار ہوش میں آ کر کئی دنوں تک توتلی زبان میں باتیں کرتے ہوئے کئی دنوں تک باپ کی گود میں بیٹھا تھا اور تب معمول پر آیا تھا جب راج کمار کے لیے ایک سائیکل اور وہی پوشاک آ گئی جو اُس نے ایک تصویر میں دیکھی تھی! سرسوتی تقریباً اسّی سال کی ہے مگر وہ ایسی باتیں کرتی رہتی ہے گویا اس کی عمر اسّی صدیاں ہے۔ وہ آج بھی مجھ سے کہہ چکی تھی کہ اس کے تارے گردش میں ہیں اور اس کی بیماری نہ تو دوائیوں سے ٹھیک ہو سکتی ہے اور نہ نمک کم کھانے سے گرہوں کا دباؤ کم ہوگا۔ اس کو یقین ہے کہ جس دن اُس کے غریب بیٹے مل کر ایک بھیڑ کی قربانی دیں گے اُس دن وہ ایک ہرنی کی طرح دوڑنے لگے گی!

سرسوتی پر لوگ ہنستے رہتے ہیں۔ محلے والے راج کمار پر بھی ہنستے رہتے ہیں۔ جبکہ محلے کی عورتیں اس کی بیوی کو سدھ لکشمی سمجھ کر اُس کا احترام کرتی ہیں۔ شروع شروع میں اُس کی خوبصورتی کو بُری نظروں سے دیکھنے والے مرد بھی اُس کے بھجن کیرتن سن کر اُس کو میرا بائی سمجھتے تھے، مگر جب وہ مجھ سے باتیں کیا کرتی تھیں تب مجھے اس میں ایک روحانی عورت کی بجائے ایک ذہین، وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملانے والی ایک قول سے زیادہ عمل پر چلنے والی ایک سمجھ دار عورت نظر آیا کرتی تھی اور اس کا احساس پہلی بار تب ہوا تھا جب تقریباً اٹھارہ سال پہلے وہ پہلی بار میری بیوی کی گزارش پر میرے گھر میں بھجن کیرتن کرنے آئی تھی۔ دوسری عورتوں کو لڑکیوں کی پیدائش پر دلاسہ دے کر لڑکی کو بھگوتی کا درجہ دینے والی ماں اپنی تیسری بیٹی ہیما کی پیدائش سے اس قدر گھبرا گئی تھی کہ میں نے پوچھا تھا کہ اگر تمھارا تیسرا بچہ لڑکا ہوتا تو کیا خوش ہوتی؟ تب اُس نے قہقہہ لگا کر کہا تھا کہ وہ اس لیے کہ میرا دوست راج کمار صرف بچے پیدا کر سکتا ہے۔ اُس کا فوراً آپریشن کروا دو ورنہ یہ پچیس سال کی عورت جو آج تین بچوں کی ماں ہے اگلے دس برس میں ایک درجن بچوں کی ماں ہوگی! اُس دن اُس نے ایک اور بات بھی کہی تھی مگر میرے ذہن میں ایک سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ شاید سرسوتی ٹھیک ہی کہتی ہے کہ پچھلے جنموں کے اچھے کرم اس جنم میں پھل دیتے ہیں۔ راج کمار کو تخت ملنا، حکومت کرنے کے لیے ایک نکتے اَن پڑھ کو رانی جیسی ذہین بیوی کا ملنا یہ سب اسی وجہ سے ممکن ہوا ہوگا کیونکہ راج کمار نے بھی پچھلے جنم میں کوئی بہت اچھا کام کیا ہوگا ورنہ دونوں ایک دوسرے کا پچھلے جنم کا حساب بے باق کر رہے ہوتے مگر پھر اچانک ہری رام کی بے وقت موت کے بعد بیوی تو بدلی نہیں بلکہ وہ رانی سے مہارانی بن گئی تھی۔ جبکہ راج کمار اپنے مرحوم باپ کے چمڑے کے بیگ کو سینے سے لگا کر اپنے محلے کی گلیوں میں بھی یوں چلتے ہوئے نظر آیا کرتا تھا گویا کوئی اُس کا تعاقب کر رہا ہو! کبھی کبھی تو وہ یوں دوڑتا ہوا نظر آتا تھا گویا ایک پاگل کتا اُس کے پیچھے کاٹنے کو آ رہا ہو! اور میں چاہتے ہوئے بھی اپنے ہم راز دوست سے یہ کبھی پوچھ نہ پایا کہ کیا یہ بھی اُس کی ڈرامابازی کا رنگ ہے؟

راج کمار کی پیدائش کے وقت ہری رام شرما ہریا تھا۔ وہ سادھو سنتوں کی خوب سیوا کیا کرتا تھا اور ایک ٹھیکیدار کا کھانا بنایا کرتا تھا۔ ایک رسویا ایک رئیس ٹھیکیدار کیسے بن گیا تھا اس کے بارے میں محلے والے طرح طرح کی کہانیاں بتایا کرتے تھے۔ حاسد لوگوں یہ کہا کرتے تھے کہ ہَریا نے اپنے مالک کو چرس پینے کی ایسی لت لگا دی تھی کہ وہ ٹھیکیدار سے ایک بابا بن گیا تھا اور یوں

ہر ِ یاایک سدھ بابا کا سیوک ہونے کی وجہ سے کرشماتی انداز میں ٹھیکیدار بن گیا تھا۔

سرسوتی کہا کرتی تھی کہ ہری رام اپنے پچھلے جنم میں کیے اچھے کرموں کی وجہ سے رنک سے راجا بن گیا تھا۔ جبکہ ہری رام بات سے بات جوڑ کر ایک ہی بات کہتا رہتا تھا کہ میرے سوامی جی نے راج کمار کی پیدائش سے پہلے مجھے بتایا تھا کہ وہ ماں کی آہوتی دے کر اپنے باپ کو راجا بنا دے گا اور حالات ایسے بن گئے تھے کہ ٹھیکیدار دُور دراز علاقے میں کام کرتے ہوئے اوب کر، نامکمل کام چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اس لیے افسروں نے اُس کو آگے رکھ کر کام ختم کر دیا تھا۔ اس دوران اُس کی بیوی مرگئی اور وہ دو سال کے بیٹے بودھو کو لے کر گھر لوٹنا چاہتا تھا مگر اس کا مالک اس کی ایمانداری پر نثار ہو کر اس کو اپنا حصے دار بنا گیا تھا۔ اور یوں اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا راج کمار ہے اس لیے امیر بنتے ہی بودھو، بودھراج کی بجائے پنڈت ہری رام شرما، اے کلاس ٹھیکیدار کا لاڈلا راج کمار بن گیا تھا اور باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو گھر کو روشن کرنے والا انمول ہیرا سمجھا کرتا تھا جس پر وہ دولت تو کیا اپنے آپ کو بھی نچھاور کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہا کرتا تھا!

میں نے خود ایسے دل دہلانے والے منظر دیکھے ہیں جب راج کمار کے سوانگ کو حقیقت سمجھ کر روتے روتے بے ہوش بیٹے کو ہوش میں لانے کی خاطر باپ اُس کے اِردگرد چکّر ویسے ہی لگایا کرتا تھا جیسے شہنشاہ بابر ہمایوں کی تمام بلائیں اپنے سر پر لینے کے لیے دعائیں کر رہا ہوتا!

میں پہلی بار راج کمار کے عالی شان محل نما گھر میں تب داخل ہوا تھا جب اُس کی انگریزی ٹوپی راج کمار کو لوٹانے آیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ ایک بڑے سائز کی ہیٹ ہوا سے اُڑ گئی تھی اور وہ سڑک پر بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ چونکہ میں نے دوڑ لگا کر ہیٹ کو سڑک سے اُٹھا لیا تھا۔ راج کمار بے ہوش پڑا تھا اور سرسوتی ہری رام کو سمجھا رہی تھی کہ راج کمار پر پھر بُرے گرہوں کا حملہ ہوا ہے اس لیے فوری طور پر ہوَن کیا جائے۔ اس سے پہلے کہ بے بس باپ ٹوٹ جاتا ٹوپی دیکھ کر راج کمار ایک گیند کی طرح اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ سرسوتی نے کہا لو مشکل حل ہو گئی۔ سمجھ لو اس لڑکے کی شکل دیکھ کر راکھشس بھاگ گیا! اس لڑکے کو راج کمار کا محافظ بنا ڈالو۔ میں سمجھ گیا تھا کہ راج کمار نے سوانگ رچایا تھا اور میری کیفیت بھانپ کر راج کمار نے مجھے اپنا جگری دوست بنا ڈالا تھا اور میں بھی ایک خودغرض دوست تو نہیں مگر ایک غرض مند دوست ثابت ہوا تھا!

سرسوتی اکثر میری ماں سے کہاں کرتی تھی کہ دیکھ لینا بھگوان کرشن سُدراما کو دوستی کا انعام دے گا۔ ساتھ میں اپنے بُرے تاروں کی گردش کے بارے میں وہی کہا کرتی تھی جو وہ آج بھی کہتی

رہتی ہے۔ یعنی کہ اُس کے گرہ اُس پر اتنے بھاری نہیں ہیں کہ ایک لمبے سینگوں والے بھیڑ کو کھا کر ہی مجھے آزاد کر سکتے ہیں۔ لیکن غریب لوگ اُتنا خرچہ برداشت نہیں کر سکتے نا؟ راج کمار جب چوتھی بار بھی میٹرک میں فیل ہوا تو ہری رام اپنے گرو سے ملنے اُس دور دراز پہاڑی علاقے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر گیا تو اپنا دکھڑا سنائے بغیر سوامی کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ یہ واقعہ مجھے ہری رام نے خود ہی تب سنایا تھا جب میں نے راج کمار کی شادی ٹالنے کے لیے اصرار کیا تھا۔ سوامی جی نے میلے کچیلے، پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک پری چہرہ لڑکی ہری رام کے حوالے کر دی تھی اور کہا تھا کہ یہ راج کمار کی رانی ہے۔ رشتے جنت میں بنتے ہیں اور جو ہونا ہے وہی ہو کر رہے گا۔

پچھلے بیس برسوں میں دو عورتوں کا گھر گھر میں چرچا ہے۔ ایک سرسوتی کا اور دوسری سدھ لکشمی کا۔ فرق اتنا ہے کہ سرسوتی بن بلائی گھروں میں جاتی رہی ہے۔ جبکہ سدھ لکشمی کو بلایا جاتا ہے۔ وہ بھی روح کے سکون کے لیے، اُس کے بھجن سننے کی خاطر یا پھر دنیاداری کے طور طریقے سیکھنے کے لیے تاکہ ایک تسلّی بخش زندگی گزاری جا سکے۔

سرسوتی گھر گھر جا کر عورتوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اُدھار، اُس کیڑے کا نام ہے جو گھر کی ٹھوس کھڑکیوں اور دروازوں کو اندر سے کھوکھلا کر کے، ہوا کے بدلتے رُخ سے گرا کر گھر والوں کو ننگا کر کے، ایک تماشا بنا دیتا ہے جبکہ سدھ لکشمی زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے گُر بتاتی رہتی ہے، بیٹیوں کو پرایا دھن سمجھ کر ساتھ میں جہیز دے کر اپنے گھر بھیجنے کے لوازمات سمجھاتی رہتی ہے، جیسے تیسے آہستہ آہستہ، ایک ایک کر کے چیزیں جمع کرنے کے مشورے دیتی رہتی ہے بلکہ اُن کا دکانداروں سے رابطہ بھی قائم کروا دیتی ہے جو قسطوں پر زیورات، ملبوسات، ہیرے جواہرات دیتے رہتے ہیں۔

شروع شروع میں غریب عورتیں اُس کو ایک رہبر سمجھا کرتی تھیں یعنی جس کی بیٹی چار سال کی تھی وہ بھی قسطوں پر رفل کے شال جمع کرتی تھی بعد میں بڑے گھروں کی پڑھی لکھی عورتیں بھی اس کی مدد سے اپنی بیٹیوں کے لیے ڈائمنڈ وغیرہ جمع کر کے اچھے اچھے رشتوں کی تمنا کیا کرتی تھیں۔ کیونکہ اُس نے بھی تو اپنی دو بیٹیوں کی شادی بہت اچھے خاندانوں کے بہت ہی اچھے لڑکوں کے ساتھ کرائی تھی۔ حاسدوں نے تب یہ کہا تھا کہ وہ دونوں ماں کی طرح بہت خوبصورت تھیں۔ ہیما کے لیے ایک اچھا لڑکا مل جائے تو ہم بھی بگڑے رئیس کی بیوی کو سدھ لکشمی مانیں گے۔ جبکہ میں یہ

سوچتا رہتا تھا کہ اگر رانی واقعی اتنی عقل مند ہے یا سدھی پانے والی زاہدہ ہے تو وہ راج کمار کو نخی حاتم بن جانے سے روک یا ٹوک تو سکتی ہے۔

میں سمجھ رہا تھا کہ دو بیٹیوں کی شادی کے بعد اپنے باپ کی مدد کرنے کی خاطر کم از کم اس کے کام کاج میں دلچسپی لے گا مگر راج کمار نئے نئے سوٹ پہن کر کبھی کسی کرکٹ کلب، ڈراما کلب، سماجی ادارے یا سیاسی پارٹی کا ڈونر بن جاتا ہے وہ بھی بے وقوف بن کر! آخر ٹھیکیدار کو کیا کوئی قارون کا خزانہ مل گیا ہے؟

اس سے پہلے کہ میں ہری رام سے پوچھ تاچھ کرتا وہ اپنی موت سے چند روز پہلے میرے گھر یہ پتہ کرنے آیا تھا کہ راج کمار کو جُوا کھیلنے کی لت تو نہیں پڑ گئی ہے؟ اس نے تب دبے دبے لہجے میں یہ کہا تھا کہ آج کل اُس کے بیگ سے ہر دوسرے تیسرے دن بڑی رقم غائب ہونے لگی ہے۔ کیونکہ شکایت کرنے والا ہی ایک ٹرک کے نیچے آ کر مر گیا تھا اس لیے میں نے راج کمار سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ خاص طور پر اس لیے کہ ہیما کی شادی بھی ایک بہت اچھے گھر میں طے ہوئی ہے۔

حاسدوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہیما شکل اور عقل سے اپنے باپ پر گئی ہے اور صرف دسویں پاس ہے پھر لڑکے والوں نے سنا ہوگا کہ مرحوم ہری رام نے اپنے پیچھے ایک خزانہ چھوڑا ہے۔

اُسی روز اس راز کا بھی انکشاف ہوا تھا کہ مرحوم ہری رام کو اپنے راج کمار پر بھروسہ اُٹھ گیا تھا مگر اُس کو راج کمار کی رانی میں اعتقاد اور اعتماد کا سنگم نظر آتا تھا اس لیے مجھے یہ بھروسہ تھا کہ روپے رانی کے پاس ہی ہوں گے۔

یہ تمام باتیں یا واقعات یاد کرتے ہوئے اگر مجھے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے ہیما نہیں ملتی تب شاید میں پوچھ تاچھ کرتا۔ مگر اس سے پہلے میں راج کمار سے بات کرتا وہ میرے پیچھے کھڑے ایک آدمی کو دیکھ کر چلانے لگا۔ رانی! مجھے میرا بیگ لوٹا دو! بیگ میں رکھے روپے ان کے ہیں؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک واقف کار ٹھیکیدار سے یہ معلوم ہوا کہ اُس نے چار دن پہلے راج کمار کو معمول کی طرح مزدوروں کو پے منٹ کرنے کے لیے ایک چیک دیا ہے لیکن چونکہ یہ غیر ذمے دار آدمی غائب ہو گیا اس لیے اُسے یہاں آنا پڑا۔

راج کمار کی دردناک چیخیں سن کر رانی کے لبوں پر مہر خاموشی دیکھ کر اور اُس کے اِرد گرد بیٹھی ہوئی عورتوں کا راج کمار کے خلاف نعرے بازی سے گھبرا کر ٹھیکیدار نے کہا کہ وہ کیس پولیس میں دے گا۔

یہ سن کر رانی چیخ پڑی۔ ''نہیں! پولیس والے میرے سرتاج کو مار پیٹ کر نہ جانے کیا کیا اُس کے منہ میں ڈال کر الٹی کرا دیں گے۔ یہ پاگل ہو گیا ہے اس کو پاگل خانے لے جاؤ۔ میں کلیجے پر پتھر رکھ لوں گی۔''

میں نے ہیما کو آواز دی تو وہ بیگ لے کر آئی اور بتایا کہ بیگ اُس کے پاپا کا ہے اور ممی نے مجھے یہ چھپا کر رکھنے کے لیے دیا تھا تا کہ شادی کی تیاریاں پوری کی جائیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ممی دادا جی کے بیگ سے اکثر روپے نکال کر تھوڑے نوٹ پاپا کو یہ کہہ کر دیا کرتی تھیں کہ دادا جی نے جیب خرچ کے لیے رکھے ہیں۔

یہ سن کر رانی رو پڑی اور کہا کہ اُس نے یہ سب اپنی بیٹی کے لیے کیا۔ نہیں کرتی تو اُس کو بھی اُس کی ماں کی طرح ایک کاغذی راج کمار ملتا۔ ہیما کو یہ احساس دلایا کہ اُس کی بہنیں ایک بہت بڑے ٹھیکیدار کی پوتیاں تھیں جبکہ وہ ایک چھوٹے ٹھیکیدار کے منشی کی بیٹی ہے۔ لیکن جب ہیما نے یہ کہہ دیا کہ وہ خود لڑکے والوں کو یہ بتا دے گی کہ وہ ایک غریب اَن پڑھ باپ کی بیٹی ہے تب چند لمحات کے لیے وہاں موجود محلے کی عورتیں سکتے میں آ گئیں، گویا اُن پر بجلیاں گر پڑی تھیں۔ پھر پہلے رانی کے اِرد گرد بیٹھی پڑھی لکھی عورتیں چلی گئیں اور بعد میں ایک ایک کر کے سبھی چلی گئیں۔ ٹھیکیدار بھی روپے لے کر یہ کہہ کر چلا گیا کہ اگر وہ فوراً پے منٹ نہ کر سکا تو میرے مزدور میرے خلاف کیس کر دیں گے۔ کیا کریں مرحوم ہری رام نے ان کو ہر ہفتے پے منٹ لینے کی عادت جو ڈالی ہے۔ گویا وہ بھی ان کے بگڑے راج کمار تھے۔

اس وقت ہیما اپنے باپ کے زخموں پر مرہم لگا کر اُس کے کپڑے بدل رہی ہے اور اپنے باپ کو احساس دلا رہی ہے کہ محلے والوں کی باتیں سن کر اس کے اندر ہی اندر آگ لگ گئی تھی۔ جب آگ کے شعلے دل کو چھو گئے تو وہ ممی کی سخت ہدایات کو نظر انداز کر کے ایک گھایل ہرنی کی طرح چیخ پڑی تھی۔

راج کمار چین کے آخری شہنشاہ کی طرح تخت سے اُتر کر ایک تختے پر آ چکا ہے چین کے آخری شہنشاہ کا بچپن اپنے خاندانی محل میں شاہانہ طور طریقے سے گزرا تھا۔ جو مانگتا تھا مل جاتا تھا اور پھر ایک راج کماری سے اس کی شادی ہو گئی جو اُس کو اپنے مطلب کے لیے اُس کو دغا دے گئی۔ انقلابیوں نے جب اس کی حکومت چھین لی تب وہ گھر گھر جا کر سائیکل پر پھول بیچا کرتا تھا۔ راج کمار ایک راجا سے ایک منشی تو بن گیا لیکن اس کی رانی ایک کھوٹے سکے کی طرح چمک تو رہی ہے مگر

اُس کو اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ بُرے وقت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ اُس بدبخت انسان کی کیا بات کریں جو عرش سے فرش پر گر کر اپنے سائے کو بھی اپنے نیچے دبا چکا ہو!

راج کمار کی آنکھوں سے بہتے آنسو کا ہر قطرہ مجھے یہ احساس دلا رہا ہے کہ اس بار وہ اپنی کسی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے ڈراما بازی نہیں کر رہا ہے اور اُس کی بیٹی اپنے باپ کے آنسو پونچھ کر اُس کی پارسائی کی پذیرائی کر رہی ہے۔ دراصل دونوں کی سچائی کی قبولیت ہی ان کی شگفتگی کا سبب ہے۔ سرسوتی میری مدد کی طلب گار ہے کیونکہ یہ واقعہ اُس کے لیے ایک عبرت ناک حادثہ ایک قہر بن کر اس کی دونوں ٹانگیں مفلوج کر گیا ہے۔ جب میں اس کو اپنے کندھوں پر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا تب وہ بڑبڑا رہی تھی ہری رام نے اپنے بیٹے کی سلامتی کے لیے لمبے سینگوں والے بھیڑ کی پوجا کی تھی اور پھر اُس کو بُرے گرہوں کے سپرد کیا تھا!

آج ہری رام کی بہو نے اپنی بیٹی کی خوشحالی کے لیے اپنے شوہر کو بے عزت کر کے بُرے گرہوں کے سپرد کرنا چاہا! میں اپنے بیٹے یا کسی پوتے کو اس سے اچھا ہے کہ نمک کھانا کم کر دوں یا پھر گرہوں کو اپنا کام کرنے دوں۔

میں سرسوتی کو لے کر چلا گیا ہوتا اگر ان کے ادھ کھلے ہونٹ میری توجہ کا مرکز نہ بن جاتے۔ گویا وہ مجھ سے کچھ کہنے کے لیے کھلے تھے مگر کہہ نہیں پائے تھے۔ اگر وہ کچھ کہہ پاتی تو کیا وہ اپنی سریلی اور سکون بخش آواز میں میرا بائی کا کوئی بھجن سناتی یا پھر وہی دنیا میں پُرکیف زندگی گزارنے کے لیے دنیاداری کی باتیں کرتی؟ مجھ سے میری بیٹی کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجنے کی بجائے یہ کہتی کہ ایک ایرانی قالین بھی خرید کر رکھ لو۔ تمھاری بیٹی گویا جادوئی قالین پر بیٹھ کر اپنے سسرال میں داخل ہوگی تو کوئی اس کو مارنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

میرے قدم تھم سے گئے ہیں اور ایک خیالاتی، جذباتی اور ذہنی کشمکش کا شکار ہو چکا ہوں اور یہ طے نہیں کر رہا ہوں کہ ایک جفا کی خوگر سے نفرت کر کے وفا کی قدروں کو اُجاگر کرنے کی سعی کروں یا ایک مظلوم ماں کی باتوں میں اپنے معاشرے کے اُن ڈراؤنے حادثوں کے عکس دیکھ لوں جو بُرے گرہوں کی نہیں بلکہ انسانوں کی شکل میں راکھشسوں کی پیداوار ہیں۔ ایک مہلک بیماری کے وائرس کی طرح!

OO

جواب

نہ تو دادا پارلیمنٹ ہاؤس جیسا ایک منفرد شخص ہے اور نہ اس کے دونوں پوتے پارلیمنٹ کے کسی ہاؤس کے ممبر ہیں۔ پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے سوالات کر کے جوابات کے منتظر رہتے ہیں۔ دادا پینسٹھ سال کا سبکدوش ہوا، ایک سلجھا ہوا افسرِ اعلیٰ ہے جبکہ اس کے ذہین پوتوں میں بڑا والا نو سال کا ہے اور چھوٹا سات سال کا ہے۔ دونوں اسکول سے آ کر اور چھٹی کے دن صبح سے شام تک دادا جی کے کمرے میں، دادا جی کی قربت کی وجہ سے تو نہیں مگر اپنی پسند کے سلسلے وار کارٹون پروگرام دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اس لیے دادا کی نوک جھونک روک ٹوک، غصہ یا پیار سے سمجھانے کے باوجود وہ نہ ٹیلی ویژن کی چینل بدل کر دادا جی کو نیوز چینل دیکھنے کا موقع دیتے ہیں اور نہ روٹھ کر اپنے کمرے میں جا کر کھلونوں سے کھیلتے ہیں یا پڑھائی کرتے ہیں۔

دادا اور اُس کے دونوں پوتے اپنی ضد پر قائم ہیں۔ بچوں سے قربانی کی توقع تو نہیں کی جا سکتی ہے حالانکہ کارٹون دیکھ دیکھ کر وہ بھی اپنے دادا کی طرح باتیں کرتے رہتے ہیں یعنی وہ اپنی میٹھی آواز میں "تم اب بچ نہیں سکتے، میں تمھیں نیست و نابود کر دوں گا" اور پھر ایسے مکالمے سن کر دادا کو زبردست غصہ تو آتا ہے مگر مکالمے سن کر نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ اس کو نیوز چینل دیکھنے نہیں دیتے!!

دادا جانتا ہے کہ آج کل کے بچے روبوٹ کی طرح وہی کرتے ہیں جو اُن کو سکھایا جاتا ہے یا پھر وہ بندروں کی طرح وہی کرتے ہیں جو وہ دیکھ لیتے ہیں۔ خاص طور پر ٹیلی ویژن پر کارٹون فیچر، سیریل اور فلمیں دیکھ کر۔ لیکن ان بچوں کے بدلے تیور دیکھ کر بوکھلا نہیں جاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی روک ٹوک میں ان کی اپنی غرض مندی یا خود غرضی بھی کہا جا سکتا ہے پوشیدہ ہے۔ پوتوں کو کارٹون دیکھنے کا چسکہ لگ گیا ہے جبکہ دادا کو دنیا میں ہو رہے واقعات سے بدل رہی صورتِ حال جان لینے کا چسکہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کبھی کبھی وہ اپنے پوتوں کو یوں سمجھتا ہے گویا وہ اُس کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں یا اس کے خلاف ایک نیا منشور لے کر الیکشن لڑ رہے ہیں۔ ایسے بہکے بہکے حالات کے دباؤ میں دادا نے آج ٹیلی ویژن کا ریموٹ اپنے پاس رکھ لیا ہے اور وہ اپنے پوتوں سے جنگ لڑنے کے لیے تیار ہے اور وہ بھی ایک ایسی حکمتِ عملی کے ساتھ جس میں جذبات کی

چاشنی بھی تھی یعنی اگر دادا کے ساتھ پوتوں کا ٹکراؤ ہو تو ان کو سزا دینے کے لیے کارٹون چینل کاٹ دیا جائے اور اگر فرماں برداری کی سفید جھنڈی دکھائی جائے تو پوتوں کو چند سبق آموز پروگرام دیکھنے کی اجازت دی جائے۔ مثلاً چوہے بلّی کے کھیل، رامائن وغیرہ، مگر اس سے پہلے کہ پوتے صبح سویرے دادا کے کمرے میں داخل ہو کر ٹی وی پر نیوز چینل دیکھ کر اعلانِ جنگ کر دیتے اور دادا اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے، پوتے بھی دلچسپی سے نیوز دیکھتے رہے۔

دادا کے دل کی بات دل میں ہی رہی اور وہ نیوز کے حوالوں سے ان کو کولمبس، واس کوڈے گاما وغیرہ کے بارے میں چوکنا کر دینے والی باتیں بتاتے رہے لیکن دونوں پوتے جنگل بندی کے طرز میں سوال پوچھتے رہے:

"دادو! کیا یہ سب مر گئے ہیں؟"

"دادو! یہ دنگے فساد کیا ہوتے ہیں؟"

"دادو! ہم ہندو ہیں یا مسلمان ہیں؟"

"دادو! ہم برہمن ہیں یا ہریجن؟"

"دادو! ہم سیکولر ہیں یا فرقہ پرست؟"

"دادو! ہم عراقی ہیں یا امریکن؟"

"دادو! ہم ظالم ہیں یا مظلوم!"

"دادو! کیا پو کی مان یا ہی مین ہماری مدد نہیں کر سکتے؟"

"دادو! اگر کسی نے ہمیں اغوا کر کے آپ سے کروڑ روپے مانگ لیے تو آپ دے دینا ورنہ وہ ہمیں مار ڈالیں گے!"

"دادو! ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔"

دادا اپنے معصوم پوتوں کے منہ سے موجودہ صورتِ حال کی ایک حقیقی جھلک پا کر سکتے میں آ گیا۔ وہ ایک بھی سوال کا جواب نہیں دے پایا اور پھر چھوٹے پوتے نے دادا کی ڈھیلی گرفت سے ٹی وی کا ریموٹ نکال کر کارٹون چینل لگا دیا اور چوہے بلّی کے کارنامے دیکھ کر یوں کھلکھلا کر ہنس پڑا گویا ایک ندی کا پانی ایک چٹان کو ہٹا کر روانی سے بہنے لگا تھا۔

اپنے دادا کو ایک خاموش مینار کی مانند دیکھ کر بڑے پوتے نے دادا کی خاموشی توڑنے کی خاطر گلے سے لگا کر پوچھا "دادو! ناراض ہو گئے کیا؟" دادا اس سوال کا بھی جواب نہیں دے پایا!!

OO

اچانک

صدیوں بعد دنیا بنانے والا یہ جان گیا کہ دنیا میں جو ہو رہا ہے وہ ویسے ہو رہا ہے جیسے اس نے اپنی مخلوق کے بارے میں طے کیا تھا۔ بار بار یہ احساس ہوتا رہا کہ اچانک کچھ ایسا ہوتا رہتا ہے کہ کبھی نہ رُکنے والے وقت کی بدل رہی کروٹوں سے زلزلے آندھیاں طوفان کی گردابی سے زندگی اس قدر متاثر نہیں ہوتی جس قدر اشرف المخلوق انسان کی سوچ کی آلودگی سے خوفزدہ ہو کر یا چوٹ کھا کر شدتِ دردعیاں اور بیان کرتی رہتی ہے اور کبھی اپنے کرب کا احساس دلانے کی خاطر دُنیا والے کو مدد کے لیے صدائیں دیتی رہی ہے زندگی!

آسمان پر اپنی بارگاہ میں بیٹھا جہاں پرستش کرنے والوں یا عبادت کرنے والوں کے قصیدے سنتا رہتا ہے وہاں نوحہ خوانیوں کی دردناک آوازیں بھی سنتا رہتا ہے مگر یہ سوچ کر اُس نے ازل سے ابد تک کی زندگی کے سفر میں راستوں کی لمبائی اور اپنی مخلوق کی منزلیں بھی خود ہی طے کر دی ہیں۔ وہ رنج و غم کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بالائی صفوں سے پانی بہتا ہوا حیات کو تر و تازہ رکھ کر گلستانوں، بوستانوں اور کھیتوں کی لہک اور مہک لوٹا کر سورج کی گرمی میں سما کر پانی کی سطح چھوڑ کر بھاپ بن کر، ہواؤں کی سیڑھی پر چڑھ کر بادل بن کر آسمان میں نظر آتا ہے۔ بادل کے ٹکڑے ایک دوسرے سے ٹکرا کر برق بنتے نظر آتے ہیں اور گرج بن کر اپنے وجود کا احساس دلا کر بارش یا برف بن کر سوکھے درختوں کی شاخوں کو تر کر کے کونپلوں کو جنم دے کر خوشبو سے زندگی کی پذیرائی کرتے ہیں۔ اس لیے اُس کے لیے آہ اور واہ میں کوئی فرق نہیں۔

مگر اچانک ایک چرواہے کی دردناک صدائیں سن کر رام رحیم یا ابن مریم کو زمین پر بھیجنے کی بجائے چرواہے کی التجا قبول کر کے وہ خود ہی برف باری کے ساتھ زمین پر اُتر آیا تھا اپنی پاکیزگی کی خوشبو لے کر مگر اپنے کرشماتی سفر کے دوران وہ جہاں بھی گیا آلودگی کی بدبو نے اُس کی خوشبو کو دبوچ ڈالا تھا۔

یوں تو وہ چرواہے سے ملنے کی خاطر اپنی بارگاہ چھوڑ کر زمین پر اُتر آیا ہے لیکن چونکہ وہ

خاموشی سے اپنی منزل پر پہنچتے ہی اس چراہ گاہ، جو سیاحوں کی دلچسپی کی اس لیے ایک حیرت انگیز جگہ تھی کیونکہ یہاں کی میٹھی اور سرسبز گھاس جڑی بوٹیوں اور جنگلی پھولوں کی خوشبو میں گویا تاثیر مسیحائی ہوا کرتی تھی۔ شہر سے دُور پہاڑوں کی گود میں ایک گاؤں کے دھان کے کھیتوں کی حدود سے جڑی ہوئی ایک لمبی دشوار ڈھکی چڑھ کر یہاں سیاح گاؤں کے کاشتکار پیشے کے لوگوں کو فصل کی کٹائی سے پہلے اپنے ساتھ لے آیا کرتے تھے کیونکہ سیاحوں اور گاؤں کے لوگوں کو یہاں آ کر یوں محسوس کیا کرتے تھے کہ وہ دنیا بنانے والے کی بارگاہ کے اَن دیکھے دروازے پر کھڑے ہوں! گوجر بکروال یہاں آ کر اپنے مال مویشیوں کو چند گھنٹے ہی گھاس کھلایا کرتے تھے کیونکہ صحت افزا گھاس کو کھلا کر دوسروں کے لیے بھی گھاس چھوڑ کر چراہ گاہ کی عقیدت کا احترام کیا کرتے تھے۔ سمجھا جاتا تھا؟ قدیم زمانے میں یہاں وحدت میں یقین رکھنے والے ساتھ ساتھ ویدوں کے منتروں یا اپنی اپنی مذہبی روایات کا ریاض کیا کرتے تھے اور ان صوفی سنتوں کی بدولت ان کھیتوں میں خوشبودار دھان کی پیداوار ہوتی ہے۔

دُنیا بنانے والے کو نہ دھان کے کھیت مل رہے تھے اور نہ چراہ گاہ جہاں چرواہے کی تلاش کرتے ہوئے وہ اپنی کرشماتی اُڑان سے برفیلے پہاڑوں سے سمندر کی سطح تک جا کر جہاں بھی زمین پر قدم رکھتا تھا اچانک کچھ ایسا ہو جایا کرتا تھا کہ وہ دل شکستہ ہو کر چلا جایا کرتا تھا۔ مثلاً جب وہ سمندر کے کنارے بھاپ کو اٹھتے ہوئے دیکھ رہا تھا تب اُس نے اچانک ریت پر چند منہ کھولی سیپیوں کی گفتگو سن لی تھی۔ اُن کو دنیا بنانے والے سے یہ شکایت تھی کہ ایک سیپ میں موتی رکھ کر ہزاروں سیپیوں کے اندر بدبودار کیڑے کیوں رکھ دیے جبکہ پاس بیٹھا کچھوا بول پڑا تھا کہ کہنے کو ہماری عمر بہت لمبی ہے مگر دنیا بنانے والے نے جس کو اشرف المخلوق بنا دیا وہ ہمیں جوان بھی نہیں ہونے دیتا۔

دنیا بنانے والے نے ایک برفیلے پہاڑ پر اپنے پاؤں رکھ دیے تھے تو آس پاس بلکہ نشیبی کھائی کے اس پار پہاڑی چوٹیوں پر بھی برف دیکھ کر وہ خوش ہوا تھا کیونکہ یہ پانی کے ذخیرے دنیا کو تروتازہ رکھیں گی۔ آبیاری اور آبپاشی سے زمین مہک اُٹھے گی۔

اچانک اس کی توجہ چند سرگوشیوں پر مرکوز ہو گئی تھی اور وہ جان گیا تھا کہ وہ دو ملکوں کی سرحد پر کھڑا تھا اور اس کے پاؤں کے نیچے ایک زمین دوز فوجی بنکر ہے۔

وہ اندر جا کر فوجیوں کی باتیں سنتا رہا جبکہ فوجیوں کو وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک فوجی اپنی عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا تھا۔ یہ دھماکہ بالائی حصے سے آیا ہوا ایک برف کا تودہ ہمارے اوپر گزر کر نشیبی علاقے میں چلا گیا ہوگا۔ توپ کا گولہ ہوتا تو دھماکے کی گونج سنائی دیتی۔ جواز سے وہ مطمئن نظر آرہے تھے! اور خوشی سرد ہواؤں کو چیر کر نکل پڑی تو وہ باتیں کرتے رہے!

اچھا ہے جو بے وقت کی برف باری ہوئی۔ اب چند ہفتوں تک دراندازی نہیں ہوگی۔ پھر ہمیں یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟ ایک اور فوجی جب بولا تب کئی فوجی بھی ہم خیالی کا اظہار کرنے لگے تو ان کو ایک عقلمند فوجی نے ٹوکا تھا۔

ارے بے وقوفو! جو برف باری سے پہلے گھس آئے ہیں ان کا کیا؟ سالے کبھی بھی ہم پر حملہ کر سکتے ہیں؟ اس لیے ہمارا یہاں رہنا ضروری ہے۔ ملک کے پاسبان بن کر۔ سنتری بن کر!

مگر ایک بات تو ہے۔ ایک فوجی آہیں بھر کر بڑبڑاتا رہا! چھ مہینے گزر چکے ہیں۔ وہ بھی تو ہماری طرح اپنے سرحد کی نگہبانی کرتے ہیں اور ان کو بھی اپنے بال بچوں کی یادیں تو آتی ہوں گی۔ اپنے گھروں کو جاتی ہوئی سڑکیں، گلیاں، کوچے یاد آتو رہے ہوں گے؟

دنیا بنانے والے نے ایک ملک بنایا تھا۔ فرنگیوں نے اس کو بھارت اور پاکستان بنا دیا۔

یہ وہ فوجی تھا جس کو عقلمند سپاہی نے احمق کا نام دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بولتا ایک اور دھماکہ ہوا تھا۔

تب عقلمند بول پڑا، ''دیکھا! بارود کی بدبو آرہی ہے نا؟ اور دھماکے کی گونج بھی!'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا دنیا بنانے والے نے اپنی کرشماتی نگاہوں سے دیکھا گونج سے ہل چکے پہاڑ کے بالائی حصے سے ایک گیند جتنا برف کا ٹکڑا تازہ تازہ ہوئی برف پر چکر لگاتے ہوئے، اپنے محیط کو بڑھاتے ہوئے نشیبی علاقے میں ایک تودہ بن کر گزر چکا ہے اور لگاتار برف سے اپنا محیط بڑھاتا ہوا پہاڑ کی دو چوٹیوں کے درمیان ایک کھائی میں رُک کر، گویا دو چوٹیوں کے درمیان ایک پل بن چکا تھا۔

اس دوران اچانک فوجیوں کو مضبوط بنکر کی دیواروں سے ٹکراتے ٹکراتے لہولہان ہو کر دم توڑتے ہوئے دیکھ کر یہ سمجھ چکا تھا کہ بنکر کو تودے نے اپنے لپیٹ میں لے کر جوانی میں ہی فوجیوں کی زندگی کا سفر ختم کر دیا ہے۔

اُس کو حیرت ہو رہی تھی کہ اس کے سامنے موت خون بہتے بہتے آئی جبکہ اُس کے تصور میں موت سے خون جسم کو ہوا کے ساتھ مل جاتا ہے اور جسم پانی سے مل کر اور مٹی مٹی سے مل کر اپنا وجود
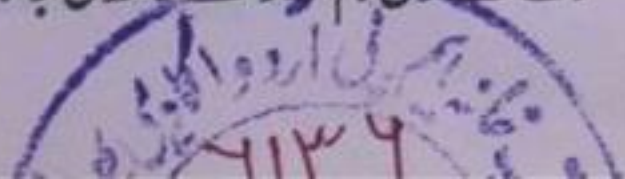
کھو دیتے ہیں۔ یہ سب سوچتے سوچتے جب وہ بنکر سے باہر آیا تھا تب باہر پہلی بار تاریکی دیکھ کر اچانک چونک پڑا تھا۔ ایسا اس لیے کہ اس نے اپنی بارگاہ سے اپنے محور پر گھومتی ہوئی اپنی بنائی ہوئی دنیا کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

نہ طلوعِ آفتاب اور نہ غروبِ آفتاب دیکھا بلکہ اُفق پر کھڑی سحر کے بھیگتے ہوئے اُجلے پھیلتے ہوئے دائرے یا شفق کے لال رنگ کے سکڑ رہے دائرے شام کی چادر میں سماتے دیکھ لیے ہیں۔

مشرق اور مغرب کا تصور بھی نہیں ہے کیونکہ اس نے جب بھی اپنی بنائی ہوئی دنیا دیکھی ہے نہار میں دیکھی ہے۔ سورج کی اجلی کرنوں میں چھپے سات رنگوں کے عکس میں دیکھی ہے اور وہ حیران تھا کہ یہ اُجلے پن کو دبوچنے والی تاریکی اس کی مرضی کے بغیر کہاں سے آئی؟

کیا یہ سورج گرہن ہے؟ اگر ہے تو اس کی اجازت کے بغیر کیوں ہوا؟ کہیں اُس کی بارگاہ پر شیطان قابض تو نہیں ہو گیا ہے؟

اچانک اُس کو ایک چکور اور چکوری کی ہو رہی گفتگو نے اپنی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ چکور چکوری کو طنزاً کہہ رہا تھا۔ رات کا انتظار کیوں کرتی رہتی ہے باوری چکوری؟

چکوری بول پڑی تھی کہ وہ رات کی تاریکی کو چیر کر روپہلی بنانے والے چندا کا انتظار کر رہی ہے کیونکہ وہ چندا سے پیار کرتی ہے!

چکور نے قہقہہ لگا کر کہا تھا کہ جل چکا ہے چندر ما، سلگ رہی ہے چاندنی! یہ رات کی تاریکی نہیں یہ دھوئیں کا تکلیف دِہ اندھیرا ہے۔ تمھیں ہی کیا دنیا بنانے والے کی مخلوق کو اندھا بنا ڈالنے کی خاطر تاکہ آگ لگانے والا ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے جاسکے یا پھر ہم پرندے کیا چرندے بھی ایک دوسرے سے ٹکرا کر مر جائیں! ہوائی جنگ میں گر جانے والے طیاروں کی طرح!

یہ سن کر دنیا بنانے والے نے دھوئیں کو چیر کر ایک سر بہ فلک چنار کو دیکھا تھا۔ چنار کے درخت نے موسم بہار کی طرح اپنی خوشبو سے پذیرائی کرتے ہوئے صدیوں سے اُس کو پیار کا یقین دلایا تو تھا مگر اچانک پتوں کی باتوں نے اس کو پھر چونکا دیا تھا۔ اور سراسیمگی کے عالم میں وہ اپنی بنائی دنیا کے اَن چاہے بلکہ اَن سوچے حالات اور واقعات سے جڑی باتیں سنتا رہا۔

ایک جوان پتے نے دوسرے پتوں سے کہا کہ دنیا بنانے والے نے ہمیں سوکھی شاخوں پر کونپلوں کی شکل میں جنم دیا اور پھر ہم سب کو جوان بنا کر اپنے خالق کی کاریگری کا بے نظیر تحفہ بنا دیا ہے۔ دوسرے پتے نے بات سے بات جوڑ کر کہا تھا۔

ہوا میں ہمیں جھول کر جو آواز پیدا ہوتی ہے اس میں تاثیرِ سکون ہے، ایسا ایک عبادت کرنے والا کہہ رہا تھا۔ ہندو تھا یا مسلمان تھا یہ میں جان نہیں پایا مگر میں نے اُس انسان کو دیکھا تھا۔

تیسرے نے اپنی بناوٹ، رنگ اور خوشبو کا ذکر کیا تھا تو ایک اور پتہ بول اٹھا تھا کہ چاندنی میں ہم سب کا رنگ روپہلا کیوں ہو جاتا ہے۔ کیا آفتاب اور مہتاب اپنی پسند کے لباس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کالا رنگ کس کی پسند ہے؟

ایک پتّے نے اپنی عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا، ارے بے وقوفو! ہمارا رنگ روپ اور خوشبو نہ کبھی بدل سکتی ہے اور نہ دنیا بنانے کے کرم سے ہم ادھورا سفر طے کر کے آقا کے پاس لوٹ کر جائیں گے۔ ایسا صدیوں سے ہوتا رہا ہے۔ بہار سے خزاں تک ہماری کہانی وہی رہے گی جو صدیوں سے سنائی جا رہی ہے یعنی شاخوں سے جدا ہونے سے پہلے ہمارا رنگ چمکیلے سبز سے پہلے جامنی ہوگا اور پھر زرد! آخری دم تک نہ مرجھائیں گے اور نہ اپنا وقار کھوئیں گے اس لیے شکر کرو اُس کا جس نے ہمیں ایسا بنا دیا!

پھر وہ پتہ بول پڑا تھا جس کو عقلمند پتّے نے احمق کا نام اس لیے دیا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ خدشات اور اندیشوں کی آڑ میں اکثر چوکس رہنے کے لیے بڑبڑاتا رہتا تھا۔ اس بار وہ اشرف المخلوق کے ہاتھوں میں کلہاڑی، بندوق یا صدیوں پرانے درخت کے کھوکھلے تنے میں چھپائے گئے آر ڈی ایکس کے بارے میں کہہ نہیں رہا تھا بلکہ یہ بتا رہا تھا کہ جوانی میں ہی ہمارا رنگ کیوں بدل رہا ہے۔ جامنی کی بجائے کالا کیوں ہو رہا ہے؟

عقلمند پتّے نے مسکرا کر کہا تھا۔ اشرف المخلوق کی کارستانیوں نے غبار پیدا کر دیا ہے۔ بارش دھو دے گی یہ کالا پن گویا گرج کی آواز کا حوالہ دے کر وہ سبھی کو بارش کا انتظار کرنے کا فتویٰ سنا رہا تھا— عقلمند بند!

اچانک دو چیلیں جو اُڑ کر آئی تھیں اور ایک شاخ پر بیٹھ گئی تھیں، اپنی گھبراہٹ پر مشکلاً قابو پا کر کہہ رہی تھیں کہ وہ خوش تھیں کیونکہ حیوان بھی ان کا گوشت نہیں کھاتے ہیں اس لیے شکاریوں کی نظریں ہمیں دیکھنا تک گوارا نہیں کرتیں اس لیے ان کو بارود سے ڈر نہیں مگر جنگل کی آگ سے ہے۔ وہ خوف زدہ تھیں یہ سوچ کر کہ ان رس بھرے درختوں کا زہریلا دُھواں تعاقب کرتے ہوئے یہاں بھی پہنچ گیا تو ہماری خیر نہیں۔ ہاں اونچی اُڑان کرنے والے گدھوں کو زمین پر اَدھ جلی بے شمار حیوانوں اور انسانوں کی لاشیں ملیں گی۔

دُنیا بنانے والا اچانک کالے رنگ کے سارے چنار کے پتوں کو زمین پر گرتے دیکھ کر اور پاس ہی ایک بہت بڑے بنگلے کو جلتے دیکھ کر لرز اٹھا تھا۔ وہ اپنی کرشماتی سن لینے کی طاقت سے کچھ لوگوں کو یہ کہتے سن چکا تھا کہ بنگلے میں دہشت گردوں کا بارود کا ذخیرہ تھا اور کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ وہاں فوجیوں کی کوئی اہم میٹنگ ہو رہی تھی۔

آگ محلے میں پھیل گئی تھی اور محلے والے چنار کے درخت کی پناہ میں آئے تھے مگر کسی دہشت گرد کے عورتوں، بچوں، بزرگوں کے بیچ چھپے رہنے کی وجہ سے فوجیوں نے پانی کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ بھگدڑ میں چند بچوں کو روندھنے سے بچانے کی خاطر چند عورتوں کی لاشیں کیچڑ میں نظر آئی تھیں۔

چیلیں خوش تھیں کہ آگ بجھا دی گئی تھی اور وہ لاشوں کو نوچنے کے لیے تیاری کر رہی تھیں جبکہ چنار کے درخت کی شاخیں اپنے پتوں کو جوانی میں کالا کفن اوڑھ کر بدبودار کیچڑ میں دفن ہوتے دیکھ کر بار بار نوحہ خوانی کرتے ہوئے صدائیں دے رہی تھیں کہ کاش دنیا بنانے والا یہ منظر دیکھ لیتا تو شاید وہ بھی خون کے آنسو رو دیتا۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا کے بارے میں زمینی حالات اور واقعات کے بارے میں سوچ پاتا اچانک چرواہے کی درد بھری آواز سن کر اپنی کرشماتی نگاہوں سے سخت ڈھلکی چڑھتے ہوئے چند لوگوں کو اپنے سر پر اٹھائے مٹکے لے کر دیکھ لیا جو یوں ہانپتے ہوئے بھی خوشی کا اظہار یوں کر رہے تھے گویا ان کو قارون کا خزانہ مل چکا تھا۔

اپنی مخلوق کے ماضی کے بارے میں اپنی آنکھیں بند کرتے ہی جان لینا آسان تھا اس لیے وہ جان گیا تھا کہ یہ لوگ سیاسی افراتفری سے پہلے سیاحوں کے ساتھ آیا کرتے تھے اور من چاہی کمائی کر کے سال بھر خود کو جنت میں رکھ کر اپنی خواہشیں پوری کرتے ہوئے دنیا بنانے والے کے قصیدے گایا کرتے تھے۔

دراصل شہر سے بہت دُور اس اونچی پہاڑی برف کی چادر سال بھر اوڑھ کر بھی اپنے دامن میں ایک دائرے کی شکل میں ایک انوکھی کرشماتی چراگاہ ہوا کرتی تھی جہاں سیاحوں کو ایک بہت ہی لمبا اور دُشوار اور خطرناک سفر طے کرنے کے بعد سر سبز گھاس اور جڑی بوٹیوں کے علاوہ جنگلی بیل بوٹوں، جنگلی پھولوں کی خوشبو جب ان کی پذیرائی کیا کرتی تھی تب ان کو یہ احساس ہوا کرتا تھا کہ وہ دنیا بنانے والے کی بارگاہ کے دروازے پر کھڑے ہیں اور ان کی مرادیں پوری ہو جایا کرتی تھیں۔

یہ وہی جگہ ہے جہاں فقط رشی منی صوفی سنت اور خدا کے نیک بندے اس عالم کے خیالات کی پاکیزگی کی خوشبو میں ایک دوسرے کی عقیدت کو بدبو کی آلودگی سے دُور رکھ کر ایک دوسرے میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔

دلچسپی سے شناسائی ہو جایا کرتی تھی، شناسائی کے بعد رسائی۔ رسائی سے ہم خیالی۔ ہم خیالی کے بعد ہم سفروں کا مشترکہ زندگی کا سفر۔ اور پیار محبت کے بیج دماغ سے دل میں جڑیں پکڑ کر کہیں گلستان کہیں بوستاں، کہیں آبشاریں اور کہیں جھیل۔ کہیں پرندوں کی چہک، کہیں خوشحال کسان اور مالی اور باغباں کی خوشیوں کی دھنک اور کہیں رنگ برنگی گلستانوں کی مہک اور کہیں سرسبز کھیتوں کی لہک۔ یہی اس کا تصور تھا اور حقیقتاً بھی اس چراگاہ میں دنیا بنانے والے سے پرستش کرنے والے یا عبادت کرنے والوں کی ایک ہی مانگ ہوا کرتی کہ دنیا شیطان کے ارادوں سے دُور ہے لیکن اب اپنی ہی زمین پر اُتر کر ایک کیچڑ آلودہ بیابان کو دیکھ کر وہ خود ہی لرز گیا تھا۔ گویا اپنے تصور کو مسخ ہوتے دیکھ کر سوچتا رہا کہ اُس کو اپنی کرشماتی نگاہوں سے یہ منظر کیوں نظر نہیں آیا۔

مسخ کرنے والے کیوں نظر نہیں آئے۔

کیا اُس کی دنیا میں اس کے حکم کی ضرورت نہیں رہی۔

چرواہا نظر آیا تو اُس کو چرواہے کے اپنے کندھوں پر ایک بکری کا بچہ تھا جو تھکاوٹ کی وجہ سے بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا اور اگر وہ ہوش میں نہ آجاتا تو قصائی کے حکم کے مطابق چرواہے کو اس کو آخری دم لینے سے پہلے حلال کرنا لازمی تھا۔

چرواہے کو اس کے لڑکپن پر ترس آچکا تھا۔ جب دنیا بنانے والے نے اس کو ایک گھاس سے بھری چراگاہ کی بجائے ایک کیچڑ سے بھرے بیابان میں ایک سوکھے پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے دیکھا تب وہ بچہ اس کی گود میں تھا اور وہ اپنی مٹھی میں رکھے چند سرسبز پتے اس کو یوں کھلا رہا تھا جیسے وہ ایک انسان کے بچے کو بوتل سے دودھ پلا رہا ہو۔ بلکہ چرواہا جو اونچی آواز میں گا کر مدد کے لیے صدائیں دے رہا تھا، گو درد بھری آواز میں ایک لوری کی طرح گا رہا تھا۔ بھوکے بچے کو سُلانے کی خاطر!

تم اللہ ہو یا ایشور

میں تم سے مخاطب ہوں۔ دنیا بنانے والے!

تیرے پاکیزہ آنگن میں

تیری تاثیرِ مسیحائی والی گھاس

اکھاڑ دی ہے کس نے؟
جاہل کی جہالت یا غافل کی غفلت نہیں ہو سکتی ہے
کیونکہ تو سمجھ کس میں آلودگی کا اثر ہو سکتا ہے!
جابر کی بربریت یا شاطر کی سیاست
سوچ میں آلودگی کا اثر ہو سکتا ہے
سمجھ کو آلودہ سوچ نے تباہ کن بنا دیا ہے؟ دنیا بنانے والے!
چراگاہ کو اکھاڑ کر اجاڑ کر
بدبودار بیابان بنا دیاں ہے۔ دنیا بنانے والے!
مخلوق کی محبت کو نفرت میں بدل دیا ہے۔ شیطان کے ارادوں نے!
ایک بار زمین پر اُتر آ۔ دنیا بنانے والے!

اچانک دنیا بنانے والے نے چرواہے کی بھیڑ بکریوں کو تو دیکھا مگر مٹکے پر اٹھا کر یہاں آ چکے بے روزگار بھکاریوں کو آس پاس نہ دیکھ کر اپنی کرشماتی طاقت سے وہ جان گیا کہ چرواہے اور اس کے چرندوں سے پہلے وہ یہاں دھان کو سکھانے آئے تو تھے مگر وہ مٹکوں کو خالی کرتے ہی رو پڑے تھے مگر ایک عجب کیفیت مٹکے خالی ہوتے ہی وہ خوش ہو کر چل پڑے تھے۔
مٹکوں میں بیج والے دھان کے دانے جڑیں نکال کر بدبودار بن چکے تھے اس لیے زمیندار کی سخاوت نے بھکاریوں کو خوشبودار چاول کھانے سے محروم کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ خالی مٹکے بیچ کر ایک وقت کا کھانا کھانے کی آرزو لے کر شہر لوٹے تھے جہاں ایک اجنبی ان کے مٹکے توڑ کر ان کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اپنا کام کروانے کی خاطر۔ یعنی اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر بھوکوں سے کام کروا کر!

اچانک دنیا بنانے والے کی نظریں دھان کے دانوں پر رُک گئیں کیونکہ بھیڑ بکریاں دانوں کے ڈھیر کو اپنے چوزوں کو لے کر مرغ اپنے پنجوں سے کرید کرید کر پیٹ بھرنے کے لیے کیڑے مکوڑے بھی کچرے کے ڈھیر سے کھرچ کھرچ کر چونچ مار کر کھا رہے تھے۔
دھان کے دانوں میں جڑ دیکھ کر دنیا بنانے والے کو پہلی بار صدمہ ہوا تھا یہ جان کر کہ گھاس کھانے والی اُس کی مخلوق گویا ایک حاملہ عورت کو ایک مگرمچھ کی طرح نگل رہی تھی۔ یہ دیکھتے ہی وہ اچانک ان کی باتیں سنتا رہا۔ وجوہات جان لینے کی خاطر کیونکہ اُس نے اپنی مخلوق کے بارے میں

ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ گویا اُس کو اپنی خدائی پر یقین نہیں رہا تھا۔

ایک بیج آہ بھر کر کہنے لگا۔ آخر ایسا کیا ہوا جو ہمیں کاشتکار نے ٹھکرا دیا۔ وہ تو ہم سب سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتا رہا تھا۔ اچانک ایک پالنہار جلاد کیسے بن گیا۔ حیران ہوں اور پریشان بھی!

دوسرے بیج نے اپنی عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سمجھایا۔ وہ کیا کرتا جو خود کسی کا نوکر ہو؟ مٹکے زمیندار کو دیتے ہوئے اُداس تھا۔ بے چارہ کاشتکار! میں نے اُس کی سسکیاں سُنی تھیں۔ کہہ رہا تھا کہ ہماری نسل ختم ہو جائے گی!

ایک اور دانا بول پڑا۔ میں نے زمیندار کو شتکاروں سے اپنے کھیتوں میں دھان کی کاشت کی بجائے بھانگ کی کاشت کرنے کی ہدایات دیتے ہوئے سنا ہے۔ گویا ہم اُٹھ گئے دنیا بنانے والے تیرے جہان سے!

عقلمند دانے نے ٹوک کر کہا۔ ارے احمق! ہم چونکہ خوشبودار چاول پیدا کرتے ہیں اور سرحد پار چاندی کے بھاؤ بکتے ہیں وہ ایسی ہدایات کیوں دیتا؟

احمق دانہ بول پڑا اس لیے کہ بھانگ سے چرس بنتی ہے اور چرس سونے کے بھاؤ بک جاتی ہے۔

اس سے پہلے کہ احمق دانہ کچھ اور راز کی سنی ہوئی باتیں دوسرے دانوں کو سناتا ایک پرندہ چونچ مار کر تینوں کو نگل گیا۔ دنیا بنانے والا سوچتا رہا کہ اگر اس سلسلۂ پیداوار کو جاری رکھا جاتا تو ایک بیج اپنے خوشے میں بے شمار دانے پیدا کر دیتا ہے اور یوں صدیوں تک کھیتوں میں پیداوار ہوتی رہی ہے!

بیج مٹی یا پانی میں جانے کی بجائے کسی کے شکم میں جا کر اپنی پہچان کھو دے گا۔ اشرف المخلوق اس تباہی کے بارے میں کیوں نہیں سوچ پایا۔ اور وہ آسمان پر بیٹھا کیوں یہ سب جان نہیں پایا؟ چرواہے کی مانگ معقول تھی اور وہ زمین پر آ کر زمینی حقائق جان کر مطمئن نظر آ رہا تھا۔

مگر اچانک ایک بکرے نے دنیا بنانے والے کو چونکا دیا۔ وہ رُک رُک کر بول رہا تھا۔

ہم لوگ انسان کی زبان سمجھتے ہیں۔ ان کے ارادوں کو سمجھتے ہیں۔

کاش ہم بول سکتے؟

دوسرے بکرے نے ٹوک کر کہا، تو کیا کرتے؟

قصائی سے زندگی کی بھیک مانگتے؟

ارے بے وقوف جب تم گھاس پر ترس نہیں کھاتے تو قصائی تم پر ترس کیوں کھائے؟

ایک اور بکرا بول پڑا۔ اتنا تو کہہ سکتے تھے کہ وہ ہمارے لیے پہلے کی طرح ہمارا چارہ منگوا کر ہمیں کاٹ دینے سے پہلے ہماری بھوک مٹا دینے کے لیے ان ویران بیابانوں میں نہ بھیجا کرے۔ ہماری شہ رگ کاٹنے سے پہلے ایسے دشوار سفروں کے دوران سانسوں کو بے قابو ہو کر ہمیں جب یہ سخت ڈھلکیاں چڑھتے عذاب ہو جاہے تب ہم زندہ ہوتے ہوئے بھی مر جاتے ہیں۔ جو بکرا یہ بول رہا تھا وہ گویا سزائے موت سے پہلے حلق کو تر کرنے کی خاطر دو بوند پانی مانگ رہا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ اگر گر پڑے یا چل نہیں پائے تو شہ رگ کٹتے ہی دنیا بنانے والے کے پیارے ہو جائیں۔

احمق بکرے کے بار بار ٹوکنے کے باوجود عقلمند بکرا ایک لیڈر کی طرح تقریر کرتا رہا۔

مہنگائی کی وجہ سے قصائی نے ہمارا چارہ ٹریکٹروں میں لانا بند کر دیا مگر پھر بھی گوشت کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے صبح کاٹا بکرا شام تک نہیں بک جاتا۔ اس لیے روز ایک بکرا کٹ جائے گا۔ اور وہ بھی جوان بکرا جبکہ ہم جیسے موٹے بکروں کو شادیانوں پر کاٹا جائے گا۔

کیونکہ سیاسی افراتفری کی وجہ سے نہ شادیانے ہوں گے اور نہ ہمیں موت آئے گی۔ اس لیے بوڑھوں کے لیے خوش خبری ہے۔ ہے کہ نہیں؟ یہ باتیں میں نے خود سن لی ہیں۔

اچانک ایک دھماکے کی آواز سن کر احمق بکرا بول پڑا۔ اور جو میں نے سن کر جان لیا تھا وہ ہو گیا۔ پھر فسادات سڑکوں اور گلی کوچوں میں شروع ہو چکے ہیں اور خطرہ قصائی کے سامنے ہے۔ یعنی سستے گوشت کی زبردست بکری کے لیے دباؤ اور تناؤ!

احمق بکرے کی آدھی بات سن کر تذبذب اور تجسس کے گردابی طوفان کی وجہ سے دنیا بنانے والا اُڑ کر شہر میں اُتر گیا۔

شہر میں کرفیو تھا۔ پُر اسرار خاموشی تھی۔ سڑکوں پر بے شمار لاشیں تھیں۔ خون سے لت پت گولیوں کے نشانات انسانوں کے جسموں پر نظر آ رہے تھے اور کچھ روندھی کچلی لاشیں جن سے بدبو آ رہی تھی۔ اپنی کرشماتی سمجھ سے وہ پلٹ کر دیکھ کر گزر چکے واقعات اور لمحات کو دیکھ کر جان گیا کہ قصائی نے ایک گائے کے گوشت کی بکری شروع کر دی تھی تو مذہب کی آڑ میں فرقہ پرستی کی آلودگی سے ایک موقع پرست نے رائی کا پہاڑ بنا کر اپنے دشمنوں کو للکار کر اس فائرنگ سے سارے شہر میں جنگ کے آثار پیدا کر دیے تھے۔ مذہب پرستوں کو اپنی چالبازیوں کا یرغمال بنا کر فرقہ پرست اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ مگر دنیا بنانے والا اشرف المخلوق کی مکاری جان کر حیرت میں

پڑ گیا وہ اس لیے کہ گزر چکا وقت واقعات کے نشانات چھوڑ کر حقیقت سامنے لے آیا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ ایک ہندو نے اپنی عقیدت کے مطابق مرنے کے بعد جنت میں اپنے لیے ایک گوشہ پانے کی خاطر اپنی گائے کا دان کیا تھا۔ دان لینے والے ہندو کو جب یہ معلوم ہوا کہ گائے بچہ پیدا کر نہیں سکتی اس لیے دودھ بھی نہیں دے سکتی اور چونکہ گئو دان کرنے والے رسوخ والا ہے وہ جانتا تھا کہ گائے اب بانجھ ہے وہ تکرار کرنے کی بجائے گائے کو سبزی منڈیوں میں ڈنڈے کھانے بھیجا کرتا تھا یا پھر پھاٹک میں جرمانے دے دے کر تنگ آ چکا تھا۔ پھر بہت ہی کم قیمت دے کر جب ایک خریدار مل گیا تب اُس نے گائے کے مستقبل کے بارے میں سوچنے کی بجائے اپنی مشکلوں کو حل کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ چرواہے کی بھیڑ بکریوں کی باتیں سننے کے بعد لوٹ کر چلا جاتا اچانک دریا کنارے واقع ایک قدیم مندر کے ساتھ ایک پتلی کیچڑ آلودہ بدبودار گلی کے دوسری طرف ایک قدیم مسجد سے آواز سنائی دی۔ آواز میں غصے کے باوجود درد تھا۔ تڑپ تھی، گلہ تھا، شکایت تھی، اور ایک للکار بھی تھی۔

دنیا بنانے والے نے خون اور کیچڑ سے لت پت ایک بزرگ کو دیکھا جو اپنی باتیں وقفہ دے کر یوں سنا رہا تھا گویا چوکس رہنے کا اعلان:

آسمان سے اپنی دنیا کو دیکھ رہا ہوگا۔ دنیا بنانے والا!

نرگسیت کا شکار ہو کر اپنے خوبصورت چہرے کو دیکھ رہا ہوگا! دنیا بنانے والا!

نہیں، نہیں تمھارے اشرف المخلوق کی سوچ نے اس کو چاند پر حکومت کرنے کے قابل تو بنا دیا ہے مگر تیری دنیا کو آلودہ کر چکا ہے وہ!

دریا میں پہاڑوں پر مسلی ہوئی برف کا پانی تو بہہ رہا ہے مگر خون اور کیچڑ بن کر!

پرستش کرنے والوں کو ایک لوٹا پانی شیولنگ پر چڑھانے کے لیے نہیں مل رہا ہے۔

عبادت کرنے والوں کو وضو کرنے کے لیے بھی پانی نہیں مل رہا ہے!

مجھے اپنے سوکھے حلق کو تر کرنے کی خاطر دو بوند پانی نہیں مل رہا ہے!

زمین پر آ کر دیکھ تیری مخلوق کی حالت کیا ہے! دنیا بنانے والے!

ایک گائے کو کاٹنے کی وجہ سے انسان درندہ بن کر انسانوں کو کاٹ رہا ہے۔ کیوں؟

روز لاکھوں مرغ کٹ جاتے ہیں۔ بھیڑ بکریاں کاٹی جا رہی ہیں۔ مچھلیوں کو بے آب تڑپا

تڑپا کے مارا جاتا ہے۔ ہاتھیوں کے دانتوں کو درآمد کرنے کی خاطر مارا جاتا ہے تب کوئی فرقہ کوئی تحریک کیوں نہیں چلاتا ہے؟ یہ تم نے سوچا ہی نہیں، کیوں؟

سچ تو یہ ہے کہ جو گائے کو بانجھ ہونے کی وجہ سے بیچتا ہے اس کو خریدنے والا ذبح کرنے کے لیے ہی تو خریدے گا نا؟

میں نابینا ہوں۔ جب ملک کا بٹوارہ ہوا تھا کوئی مجھے اس گلی میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کیوں؟ ساری عمر اس گلی میں کاٹ لی ہے میں نے۔

ہندوؤں کے منتر اور مسلمانوں کی آیتیں مجھے یاد ہیں اس لیے مندر اور مسجد دونوں میں کوئی نیک دل انسان مجھے ساتھ لے کر اپنائیت کا احساس دلایا کرتا تھا لیکن سوچ کی آلودگی کی وجہ سے مندر کی دیوار سے یا مسجد کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہوں تو گھسیٹ دیا جاتا ہوں۔ میں اندھا ہوں یا مجھے بینائی دے یا تو خود زمین پر آ کر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جایا پھر کسی دلدل میں ڈال دے تاکہ میں اپنی آخری سانس تک اس زمین پر پاؤں رکھ دوں جو ٹھوس ہو۔ صدیوں پہلے کی طرح!

اندھے کی باتیں سن کر دنیا بنانے والے کو اس مچھیرے کا وہ منظر یاد آ گیا جو اس نے اپنے پہاڑوں سے سمندر تک اپنے کرشماتی ہوائی سفر کے دوران دیکھا تھا۔ مچھیرا واحد انسان تھا جس کے چہرے پر نہ تناؤ کے تاثرات تھے اور نہ کسی اندیشے یا خدشات کا دباؤ عیاں تھا۔ دنیا بنانے والے نے اپنی پرواز روک کر اُس کی ذہنی یا عملی کیفیت کا بغور مشاہدہ کیا تھا جبکہ اس نے جس کو بھی دیکھا تھا آلودگی کا شکار پایا تھا جبکہ اس انسان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ سکون کے تاثرات تھے۔ گویا راضی تھا دنیا بنانے والے کی رضا میں، اعتقاد سے بھی اور اعتماد سے بھی۔

دنیا بنانے والے نے اس کو جھیل کے اس کونے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا جہاں کمل کے پھول تھے۔

یہ سوچ کر خوشبو اس کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی مگر مچھیرا کمل کے پھولوں کے ساتھ گہرے پانی میں اللہ کا نام لے کر اپنا جال ڈال کر یہ سوچ رہا تھا کہ پانی میں فقط چھوٹی بڑی مچھلیاں ہوں گی اور ایک اچھے انسان کی طرح وہ طے کر چکا تھا کہ وہ چھوٹی مچھلیوں کو اپنی کشتی میں ڈالنے کی بجائے پانی میں ڈال دے گا۔ لیکن جو جال پانی میں دیکھ رہا تھا وہ دنیا بنانے والے نے خود دیکھا تھا اس لیے وہ لرز گیا تھا۔ اشرف المخلوق نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے جہاں چاند پر جانے کی راہ بنا دی وہاں

سوچ میں آلودگی کی وجہ سے پُرسکون جھیل میں کمل کے پھولوں کی جڑوں میں ایسے آلے رکھ دیے تھے جو کسی کے بٹن دباتے ہی مچھیرے کی کشتی کو تو کیا نوح کے سفینے کو بھی اُڑا سکتے ہیں۔

یہ یاد آتے ہی دنیا بنانے والے کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ بھی اپنی بارگاہ پر اپنی ہی پاکیزگی کی خوشبو سے لطف اندوز ہو کر یہ نہیں جان پایا کہ آلودگی کی بدبو میں زندگی سے پیار کرنے والے زندہ ہیں مگر زندہ رہنے کی چاہت کو مار ڈالنے کی خاطر۔

مچھیرا ایک اُمید اور ایک ارادے کی وجہ سے خوش تھا۔ نا سمجھ تھا جو اُن بلاؤں اور آفتوں سے آشنا نہیں تھا جو اُس کا جال دیکھ چکا تھا۔ مگر وہ خود ہی جلتے ہوئے جنگل اور پرندوں کے گھونسلے جلتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ غنچوں کو ڈالیوں سمیت اُجڑ کر بدبو کو سانسوں میں دبوچ کر ان کے دلوں سے اٹھی ہوک کو محسوس کرتے ہوئے زندگی کے کرب کو محسوس کر چکا تھا۔ خاقان بن جانے کے اپنے ارادوں کو کبھی بھی نہیں ایک میزائیل دبا کر چند تیل کے کنوؤں کو حاصل کرنے کی خاطر کربلا کی یادیں تازہ کرنے کا عزم نہیں اٹھا لیا تھا۔ اپنے دائرۂ حکومت کی محیط بڑھانے کی خاطر بارود کا استعمال کرتے ہوئے دیکھا تو تھا اس لیے تو یہ توبہ کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ نہ حاکم تھا اور نہ اشارہ ملتے ہی جان قربان کرنے والا ایک انتقامی یا انقلابی۔

یہ سوچتے سوچتے اُس کو اپنے آنگن میں بیٹھے چرواہے کی دردناک آواز سنائی دی تو وہ اپنے آنگن میں پاؤں رکھ کر چرواہے کو دیکھتا رہا۔

چرواہے کو معلوم نہ تھا کہ دل شکستہ ہو کر اپنے ہاتھ میں آخری پتہ بکری کے بچے کو کھلا کر جو بھی دنیا بنانے والے کے بارے میں کہہ رہا تھا وہ اس کے سامنے اپنے پاؤں کیچڑ پر کھڑا ہو کر موجود ہے۔

وہ بول رہا تھا کہ شاید دنیا بنانے والا اپنا ہی رَچا کھیل دیکھ کر ویسے ہی لطف اندوز ہو رہا ہوگا جیسے قدیم زمانے میں ایک بھوکے شیر اور ایک غلام کی تماشائی جنگ دیکھا کرتے تھے یا کسی غلام کا سر قلم کر کے گردن پر ایک گرم تَوا رکھ دھڑ کو چند قدم چل کر دیکھا کرتے تھے فقط تفریح کے لیے۔

چرواہا بولتا رہا اور خوش تھا کہ وہ ہوش میں آ چکے بکری کے بچے کا بچپن چھین نہیں رہا تھا۔ کمر سے باندھی ہوئی چھری کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دنیا بنانے والے نے طے کر دیا کہ چرواہے کو ہی اشرف المخلوق بنانا چاہیے۔ یعنی کائنات کا محافظ!

اچانک بھیڑ بکریوں اور ان کے بچوں کی پُراسرار خاموشی کو عقلمند بکرے نے توڑ ڈالا اور وہ بے وقوفوں کو خوفزدہ کرنے والے احمق سے مخاطب ہو کر بول اٹھا۔

عوام کی آواز کے سامنے سرکار جھک گئی ہے اس لیے گولے پھٹنے کی آواز سنائی نہ دی۔ گویا قصائی اب مہنگائی کے ستائے عوام کو بے فکر ہو کر نہ صرف سستا گوشت بیچے گا بلکہ امیر طبقے کو سونے کی قیمت پر بکرے یا بھیڑ کا بالکل تازہ گوشت بیچ کر خسارہ پورا کرے گا۔ ان کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ قصائی ان کی مانگ پوری کرنے کی خاطر ہمارے بچوں کو ذبح کر دے گا۔ ہاں اگر عقلمند ہو تو۔ میری طرح!

یہ سن کر ایک بکری یوں اُچھل پڑی گویا ایک مرغی اپنے اِکلوتے چوزے کو چیل کے قریب آ کر بچانے کے لیے اُچھلتی ہے۔

بکری نے دوڑ کر چرواہے کو سینگ مار کر اپنے بچے کو اس کی گود سے آزاد کیا وہ کیچڑ پر بار بار پھسلتی بھاگتی رہی اور چرواہا ان کا محافظ ہونے کے ناطے ان کا پیچھا کرتے ہوئے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے چارہ مجبور جو تھا کیونکہ قصائی کی عدالت میں جواب دِہ جو تھا۔

دُنیا بنانے والے نے اس کو ہانپتے ہوئے یہ کہتے سنا تھا کہ اپنے بچے کے باپ کو قصائی کی مضبوط گرفت میں دیکھ چکی ہے نادان بکری، لیکن دنیا میں آ کر دنیا دیکھے بغیر لڑکپن میں اس کو قصائی کی مضبوط گرفت میں نہیں دیکھ سکتی گویا وہ ایک جوان بیوہ کی طرح اپنے کمسن بیٹے کو سینے سے لگا کر تماشائیوں کی اُس پر جمی نگاہوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو؟ کچھ تماشائیوں کی نگاہوں میں خوف، کچھ کی نگاہوں میں دردمندی کا تاثر، جبکہ چند لوگوں کی آنکھوں میں ایک چمک اُبھر رہی ہے کہ جس بیوہ کو دنیا بنانے والے نے اپنے کرشماتی ہوائی سفر کے دوران دیکھا ہوگا کہ وہ مدد کے لیے اپنی جھولی اس لیے نہیں پھیلا رہی تھی کیونکہ اُس کی جھولی میں بارود سے سینکڑوں چھید ہو چکے تھے۔

بکری کی ذہنی کیفیت دیکھ کر اچانک چرواہے کی حفاظت میں تمام بھیڑ بکریاں اپنے بچوں کو ساتھ لے کر بھاگ جانے کی غرض سے بیابان کے محیط پر بھاگتی رہی اور چرواہا اپنے آقا کی فرماں برداری مذہب پرستی کا فریضہ سمجھ کر بھی کو پکڑنے کی کوشش میں بار بار پھسل کر ہر بار اُن کو روکنے کی کوشش کرتا رہا۔

اچانک اس بدبودار بیابان کا دائرہ پھیلتا گیا جس کے مرکز پر وہ کھڑا تھا مگر اپنی پاکیزگی کی خوشبو کو چار سو پھیلانے کی بجائے خود ہی گھٹن محسوس کرتا رہا اور چرواہا اپنے چرندوں کو روکنے کی کوشش میں ایک کولہو کے بیل کی طرح وہیں پہنچ جایا کرتا تھا جہاں سے وہ سفر شروع کرتا تھا! دراصل محیط کو پار کرنے کی ان میں سے کسی کو جانکاری نہیں تھی۔ اس لیے بے بس محافظ چرواہا لاچار بھیڑ

بکریوں کو نہ پکڑ سکتا تھا اور نہ آزاد ہونے کی کوشش کرنے والے بھاگ جانے کا کوئی درّہ تلاش کر پا رہے تھے۔ ہاں سبھی ہانپ رہے تھے، کانپ رہے تھے۔

دنیا بنانے والا ان کو ایک نیا راستہ دکھانا چاہتا تھا مگر اچانک وہ بیوہ جس نے اپنے بیٹے کو گلے لگایا تھا اس کو جانے کیسے ایک پھیل رہے دائرے کے محیط کو پار کر کے ہانپتے ہوئے داخل ہوتے دیکھا تو حیرانگی کی محیط بھی پھیلتی رہی کیونکہ اس کے ساتھ بیواؤں کا ایک کارواں تھا، جس میں سرحد پر مارے گئے فوجی جوان، دہشت گردی اور بم دھماکوں میں کٹ چکے ٹکڑے لے کر، یا کراس فائرنگ میں مارے گئے معصوم بچّے، حاملہ عورتوں کے جسم سے بہہ رہے خون کی لکیروں سے خود لکھی ہوئی داستانِ حیات شامل تھیں۔ کوئی اپنے باپ کو ڈھونڈ رہا تھا، کوئی اپنے بیٹے کو جبکہ بیوائیں اپنے شوہروں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ کبھی شہیدوں کی بیوی بن جانے کا دعویٰ کرتی ہوئی قصیدوں کو گونج کے ساتھ ساتھ غداری یا مخبری کرنے کے الزامات کے نعرے بھی سنائی دے رہے تھے۔

دنیا بنانے والا حیران تھا کہ ایک ہی شخص بیک وقت شہید اور غدار کیسے ہو سکتا ہے؟ حیرت میں گویا دھنستے ہوئے دنیا بنانے والے نے ایک نئے طیارے کو دھواں چھوڑتے ہوئے آسمان کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر جب طیارے کو زمین سے اُڑانے والوں کے ارادوں کو اپنی کرشماتی سوچ سے سمجھ گیا تب وہ اس لیے بہت خوش ہوا تھا کہ اس کی ہی عطا کی گئی تخلیقی صلاحیتوں سے انسان اس کی بارگاہ پر دعویٰ ٹھوکنے کی بجائے نظامِ شمسی پر قابض ہونا چاہتا ہے۔

یہ جان کر اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنی بارگاہ میں جا کر ایسے مخلوق دشمن دماغ کو مفلوج کر دے گا اور چرواہے کو اپنی بنائی ہوئی دنیا کو اپنے تصور کے رنگ میں لانے کی سوچ سمجھ اور ارادوں سے مالا مال کر دے گا۔ دنیا بنانے والے کا عزم ساتویں آسمان سے بلند تھا اور وہ اپنی دنیا کو بچا لینے کا عہد کر چکا تھا۔ یعنی 'اب یا کبھی نہیں' کا ٹھوس عمل اور قول کا شگفتہ سنگم کے بہاؤ میں زندگی کی کشتی کا ناخدا بن کر۔

اچانک جب اس نے اپنی کرشماتی اُڑان کے لیے زمین سے پاؤں اٹھانے کی کوشش کی تب وہ جان گیا کہ وہ خندق میں پانی کی تہہ کے نیچے جمع ہوئی کیچڑ میں دھنستا جا رہا ہے۔ اس نے مدد کے لیے اپنے ہی انسانوں سے مشورے مانگے مگر وہ اپنی ہی صدائیں سنتا رہا۔ گنبد کی صداؤں کی طرح!

پھر اچانک کیا ہوا یہ وقت کو معلوم ہے۔ جو نہ رُکتا ہے اور نہ پلٹ کر دیکھتا ہے پھر اس کے

قدموں کے نشانات کیا کوئی پڑھ پائے گا؟ اس صدی میں یا آنے والی صدیوں میں؟؟

دنیا بنانے والا دلدل میں دھنس کر سوچتا رہا۔

اچانک اس کے دل سے اُٹھی ایک آواز نے اس کو چونکا دیا۔

قصیدوں کے رسیا دنیا بنانے والے! تو جانتا ہے کہ تیرے اشرف الخلوق کی کارکردگیوں کی ستم ظریفیوں کی وجہ سے منکر ہو چکی ہے دنیا! پھر تم اچھے دنیا بنانے والے نہیں رہے! نہیں رہے!! بُرے ہوں جس خدا کے بندے۔ وہ اچھا ہو ہی نہیں سکتا۔ بعد از خدا سمجھنے والے بدخو انسان! قیامت کی دستک دے رہے ہیں۔

سن رہے ہو نا دنیا بنانے والے؟

اب جو بھی ہوگا اچانک ہی ہوگا؟

گانٹھ باندھ لو دنیا بنانے والے!!

OO

گرہن

وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ رات بھر جاگ جاگ کر، ایڈیٹنگ مشین کے سامنے بیٹھ کر، بار بار اپنی ٹیپ کو آگے پیچھے کرتے ہوئے ہر بار اپنی سوئی ہوئی ٹیلی فیچر کو دیکھ دیکھ کر سمجھ نہیں سکا تھا کہ اس کی تخلیق میں آخر کس چیز کی کمی ہے یا کون سی خامی رہ گئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی بات کہہ نہیں پایا ہے۔ کیا واقعی اس کی پہلی ٹیلی فیچر میں جواز کا فقدان ہے؟ وہ جو بات اب سمجھ چکا ہے کاش وہ راز پہلے جان پاتا۔ کل تک جو لوگ اس کو میڈیا کا سورج کہا کرتے تھے وہ آج اس کو مصور وین گاگ یا ٹالسٹائی کی طرح جنونی تجربہ کرنے والا احمق دانشور کہہ کر اس کے حوصلے کو توڑنے کی خاطر ایک ہی پلیٹ فارم سے بول رہے تھے کہ اشتہاری فلمیں بنانے والے سورج پر گرہن لگ گیا ہے جبھی تو وین گاگ کی طرح اپنا کان کاٹ کر اپنی محبوبہ کو بھیج رہا ہے یا پھر ٹالسٹائی کی طرح کھڑکی سے کود کر یہ جان لینا چاہتا ہے کہ کیا انسان بھی پَر لگا کر پرندوں کی طرح اُڑ سکتے ہیں؟ ایسے تنقیدی جملے اس کو بار بار ڈراؤنے بادلوں کی گرج کی گونج بن کر اپنے ذہنی کرب کا احساس دلا رہے تھے اور ہر بار وہ اپنی فیچر کو روائنڈ کر کے دیکھتے ہوئے اپنے دل سے اٹھی ہوک کو شدت سے محسوس کرنے لگا تھا!

جب وہ صابن، ٹوتھ پیسٹ، کولڈ ڈرنک وغیرہ پر اشتہاری فلمیں بنایا کرتا تھا تب ناظرین کم اور ناقدین زیادہ اس کے منفرد اسلوب کے قصیدے پڑھا کرتے تھے جب وہ بذاتِ خود اپنی فیچر کو دیے گئے اسلوب پر فخر محسوس کر رہا تھا۔ ناقدین نے اس کی تخلیق کو بے موت مار کر مرثیہ پڑھنا شروع کیا تھا تاکہ لاش کو دفن کیا جا سکے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے کردار زندہ ہیں۔ یہی سوچ کر اس نے ہر کردار پر توجہ دے کر بطور راوی ایک ہی سوال پوچھا تھا: ''اگر آپ کو میں ایک کروڑ روپے دے دوں تو۔ آپ کیا کریں گے؟'' کردار کی عکاسی، ماحول کی عکاسی، کردار کے جذبات، احساسات اور خیالات ان کے چہرے کے تاثرات و آنکھوں کے عمیق گہرائیوں سے ظاہر کر کے اس نے ہر کردار کا مونتاج بنا کر کئی کرداروں کا کولاج بنا ڈالا تھا۔ اور اس کی فیچر کی سب سے بڑی

خوبی یہ ہے کہ ہر کردار کے جوابات سن کر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ سوال کیا پوچھا گیا تھا۔

فیچر کا آغاز ایک سڑک چھاپ، میلی کچیلی مگر خوب صورت جوان طوائف کے جوابات سے ہوا تھا اور وہ پہلا سوال سن کر یوں ہنس پڑی گویا کسی نے اس کو رُلانے کے لیے ہنسایا ہو۔ اس کی آنکھوں میں چمک ایک پھلجھڑی کی طرح نظر آ رہی تھی بلکہ یوں دکھائی دے رہی تھی گویا تیل کی چند بوندوں کی محتاج چراغ کی باتی تیل چوس کر بجھتے بجھتے پھر جل اٹھی تھی، طوائف نے آہ بھر کر کہا تھا:

''بابو کروڑ کی بات کیوں کر رہے ہو۔ تیس پچاس روپے لے کر، کسی فٹ پاتھ پر رہنے والے یا کسی آٹو چلانے والے کے ساتھ چلی جاتی ہوں، آپ کو میرے کپڑوں یا منہ سے باس آتی ہے تو میں کپڑے بدل کر آؤں گی۔ شادی کا جوڑا پہن کر، پان تھوک کر لپ اسٹک لگا کر آؤں گی، بال دھو کر، جوئیں نکال کر اور کاجل لگا کر، چہرے پر کریم لگا کر آؤں گی۔ پھر گھر لے چلو یا ہوٹل میں، رات بھر ساتھ رہوں گی۔ لیکن تب جب تین سو روپے پیشگی اور کل پانچ سو روپے دو گے۔ پیشگی اس لیے کہ آج سامان خرید لوں گی نا؟ زیور نہیں بابو۔ جوئیں مارنے والی دوائی، خوشبودار صابن، کریم، پاؤڈر؟ آپ پھر کروڑ کی بات کر رہے ہو۔ تو سنو۔ میں کروڑ روپے لے کر دس سال کے لیے راشن خرید لوں گی؟ دس سال اس لیے کہ تب تک بیٹا بیس سال کا ہوگا اور وہ مزدوری کر کے کھلا دے گا۔ رہی بات بیٹی کی تو اس کی شادی ہو جائے گی۔ پھر روپے بچ گئے تو ایک گھر بنا لوں گی۔ ویسا ہی جیسا ہمارے گاؤں میں تھا۔ اس گھر میں میرے شوہر کو نہ کبھی کھانسی آتی تھی اور نہ کبھی بخار آتا تھا۔ خود دھان کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ گاؤں چھوڑ کر شہر اس لیے آئے کیونکہ فصل سیلاب کھا گیا۔ اور روپے بچ گئے تو بچوں کو اسکول بھیج کر خود وہی شادی کا جوڑا، جو گاؤں سے ساتھ لائی ہوں پہن کر دن رات اپنے شوہر کی سیوا کروں گی۔ بابو گھر میں راشن ہو تو میں یہ کام کیوں کروں؟ یہ اتنے سارے۔ سو سو کے دس نوٹ؟ کیوں؟؟ اتنے روپے۔ میرا معاوضہ؟ کس کام کے لیے؟ پھنسا تو نہیں رہے ہو؟

طوائف کے بعد ایک نوجوان کے جوابات تھے۔ ''ایک کروڑ؟ نہ کم نہ زیادہ؟ پچیس لاکھ روپے ڈونیشن دے کر ایم بی بی ایس کی سیٹ۔ پچیس لاکھ ایم ڈی کی سیٹ کے لیے اور باقی بچے پچاس لاکھ میں ٹریننگ کے دوران آئے خرچے کو کاٹ کر ایک عالی شان کلینک۔ ایسا میں چھ مہینے پہلے کہتا۔ تب میں بہت اچھے نمبر لا کر ایک ڈاکٹر بن جانا چاہتا تھا۔ وہ بھی موت سے لڑ کر زندگی کو بچانے کی خاطر۔ مگر اب میں زندگی کو موت کے حوالے کر دینے کا کام کرتا ہوں۔ اس لیے میں

جدید ترین مہلک ہتھیار خرید کر ایک طاقتور کی طرح کمزوروں پر حکومت کروں گا۔ ایک کروڑ سے دس کروڑ بنالوں گا۔ دس سے بیس، بیس سے چالیس۔ یہ کیا مسٹر؟ کروڑ کی بات کر کے ہزار روپے معاوضہ؟ ہزار روپے کے لیے میرا قیمتی وقت ضائع کر دیا؟'' اگر وہ نوجوان کی آنکھوں میں دہک رہے انگارے دیکھ کر اپنی ریکارڈنگ ٹیم کے ساتھ بھاگ نہ گیا ہوتا تو انوکھے ٹی وی فیچر بنانے والا خود ایک المناک خبر بن گیا ہوتا۔ حالانکہ شوٹ کیے گئے ایسے واقعات کو اس نے دانستہ طور پر اپنی فیچر میں نہیں رکھا تھا مگر اپنی فیچر کے ہر سیگمینٹ کے ساتھ جڑی یادیں جہاں اس کے احساسات کا تعاقب کر کے ڈرا رہی تھیں وہاں اس کے خیالات کو ایک نئی ترتیب دے کر یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی تھیں کہ کہیں اَنہونی کو نکال دینے کی وجہ سے اس کی معنی خیز فیچر میں جواز کا فقدان تو نہیں ہے؟ چند لمحات کے ذہنی تناؤ کے بعد وہ پھر اپنی فیچر کے اگلے حصے کو دیکھتا رہا تھا۔ نوجوان کے بعد اس کی فیچر میں ایک پُر اسرار بوڑھے کا انٹرویو تھا جو اُس کو عدالت کے احاطے میں لوگوں کے ہجوم میں ایک مغرور شخص نظر آیا تھا کیونکہ اس کے لیے حالت ایسی تھی گویا ایک گھنے جنگل میں ہوا کے جھونکوں سے ہل رہی شاخوں سے شائیں شائیں کی آوازیں پیدا کرنے والے درختوں میں کھڑا ایک خاموش درخت۔ اس نے اس سے بھی وہی سوال پوچھا تھا بزرگ میاں! اگر آپ کو ایک کروڑ روپے مل جائیں تو آپ کیا کرو گے؟ وہ معنی خیز نگاہوں سے اس کو دیکھ کر بہت ہی نیچے سر میں بول پڑا تھا:

''پلیز۔ آہستہ بولو، ڈاکو سن لیں گے۔ لوٹ کر اگر زندہ بھی چھوڑ دیں گے تو مجھ سے دوسرا مقدمہ لڑنے کی ہمت نہیں۔ پہلے مقدمے کا فیصلہ آج ہو جائے گا، ایسا وکیل نے کہا ہے۔ سنو ایک کروڑ نہیں، دس کروڑ مل جائیں گے۔ خبر اُڑ کر آئے گی۔ تم ایک کروڑ کی بات کیوں کر رہے ہو؟

''دیکھو نہیں غور سے سنو۔ یہ جو نیل ہوتی ہے نا، نیل وہی جس سے کپڑے اُجلے ہوتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں معلوم؟ نیل کی کھیتی جس زمین میں ہوتی ہے وہ چار سال کے لیے بنجر ہو جاتی ہے۔ مگر اگلی فصل پورے چار سال کے فائدے دے جاتی ہے زمینداروں کو۔ میری زمین میں ایک سال میں دو دو فصلیں پیدا ہو جایا کرتی تھیں، اب حساب لگالو۔ ۵۶ سال میں کتنی فصلیں ہوئیں؟ اور ان کی قیمت؟ ایک کروڑ؟ نہیں، نہیں، دس کروڑ سے زیادہ ہوگی۔ لگی شرط؟ ملک کا بٹوارہ ہوا اور میری زمین آزادی کھا گئی۔ میں یہاں اور میری زمین میرے آبائی گھر کے اِرد گرد۔ افسر کہہ رہے ہیں کہ زمین اور گھر کو سیلاب نگل گیا۔ میں ثابت کروں گا کہ میری زمین کہاں تھی لیکن ایک بار مجھے سرحد پار کرنے تو دیں؟

''ہاں میرا ایک چشم دید گواہ ہے اور وہی میرا وکیل بھی ہے بلکہ حصے دار بھی ہے۔ سنا ہے آج کل جو یہاں جج ہے وہ بھگوان سے ڈرتا ہے۔ مطلب یہ کہ فیصلہ میرے حق میں ہوگا کیونکہ میرا گواہ، میرا وکیل اور حصے دار بھگوان ہی تو ہے۔'' وہ ایک پاگل تھا۔ یہ اس نے اپنی فیچر میں واضح طور پر بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا شاید یہ بھی جواز کے فقدان کی وجہ ہے؟

وہ آہ بھر کر فیچر کا اگلا حصہ دیکھتا رہا۔

سوال وہی تھا مگر جواب چونکا دینے والا تھا ''ایک کروڑ وہائٹ میں ملے گا تو بدلے میں، میں آپ کو دو کروڑ بلیک میں دوں گا۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ کاروباری آدمی ہوں۔ ایک کروڑ وہائٹ سے میں بیس کروڑ کی انویسمنٹ کر کے پرانا دھندہ بند کر کے کوئی عزت والا دھندہ کرلوں گا۔ بچے بڑے ہو گئے ہیں اس لیے اب تمام عیش گاہیں بند کر کے ایک ہوٹل بنا کر آرام سے زندگی بسر کروں گا۔''

اس نے جب ایک سبک دوش ایماندار افسر اعلیٰ سے یہی سوال پوچھا تھا تو اس نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جو جواب دیا تھا وہ اس کی فیچر کا اگلا حصہ یعنی سیگمینٹ تھا۔

''اپنے دونوں بیٹوں اور اکلوتی بیٹی کو بیس بیس لاکھ دوں گا۔ پھر ان سے ایک ایک لاکھ مانگ کر اپنے گھر کی مرمت کرلوں گا اور جو رقم بچ جائے گی اس سے اپنی بیوی کی دیرینہ خواہش پوری کروں گا۔ یعنی اس کو تیرتھ یاترا پر لے جاؤں گا۔ کن روپیوں کی بات کر رہے ہیں آپ؟ ایک کروڑ میں چالیس لاکھ تو انکم ٹیکس میں چلا جائے گا؟ سنیے آپ اگر لوگوں کی دبی خواہشات کو کرید کر نکالنا چاہتے ہیں تو سمجھ لو کہ آپ کو کامیابی مل گئی ورنہ کیا میں یہ نہیں جانتا ہوں کہ مجھ جیسے افسر کو اگر نوکری کے دوران کسی نے ایک روپیہ دینے کی جرأت نہیں کی تھی تو اب کوئی کیوں دے۔ قابلیت کا اتنا بھاؤ نہیں ہے ابھی اس ملک میں۔'' وہ واحد شخص تھا جس نے اصرار کر کے پورے یونٹ کو چائے پلائی تھی اور کہا تھا کہ ایک ایماندار افسر اپنے ہم عہدے داروں کے مقابلے میں کسمپرسی کی زندگی گزارتا ہے۔ یعنی اس کے بچے عیش نہیں کر سکتے، کلبوں میں اپنا زیادہ تر وقت نہیں گزار سکتے ہیں، ہوائی سفر طے نہیں کر سکتے، اپنے تعلقات صنعت کاروں اور امیر ترین لوگوں کے عیاش بچوں کے ساتھ نہیں رکھ سکتے مگر مہمانوں کو چائے پلا سکتے ہیں اور وہ بھی گرم جوشی سے۔

یہ حصہ دیکھ کر بھی وہ سوچتا رہا کہ اگر اس نے یہ حصہ شوٹ کرلیا ہوتا تو شاید یہ اس کی فیچر میں جواز کا فقدان نہ ہوتا۔ دل شکستہ ہو کر اس نے اگلا سیگمنٹ دیکھا جس میں اس نے ایک پُر جوش لیڈر

سے وہی سوال پوچھا تو اس نے فوراً جواب دیا تھا۔ ''پوری کی پوری رقم آپ کو دوں گا۔ اور بدلے میں حریفوں کی، حلیفوں کی یا دشمنوں کی کوئی ایسی ریکارڈنگ لوں گا جس سے ملک کا سیاسی توازن بکھر جائے اور عوام کو میں ہی، فقط میں ہی ایک مسیحا نظر آ جاؤں۔ اگر سودا منظور ہو تو سودا طے کر لیں۔ یعنی ایک ڈیل'' وہ بار بار اپنی تیار کیسٹ دیکھتے دیکھتے اس خاص حصے کو دیکھ کر اس کے آگے موجود دلچسپ حقوق کو دیکھنے کے بجائے تذبذب اور تجسس کے اثر میں ایک کلاک پینڈولم کی طرح لٹکتا رہتا ہے۔ کبھی دائیں کبھی بائیں۔

آخر ایک الارم جیسی آواز نے گویا اس کو نیند میں چلتے چلتے اچانک بیدار کر دیا اور وہ یوں چلاّ پڑا گویا ایک معصوم عدالت میں چلاّ رہا ہو کہ میں بے قصور ہوں اور میں نے قتل نہیں کیا ہے۔ اس حصے میں کیا کسی جواز کی ضرورت ہے؟ پھر اس نے یہ طے کیا کہ وہ اپنی فیچر کو وطن داروں کو دکھانے کی بجائے کسی انٹرنیشنل پینورما میں دکھا کر اپنی کہی باتوں کا جواز پیش کر پائے یا نہیں مگر یہ ممکن ہے کہ اپنے ملک کی حالت دنیا کو دکھا کر اس کو اعزاز یا انعام حاصل ہو جائے۔

پھر ضمیر جاگ پڑا تو وہ سوچنے لگا کہ کہیں کوئی لیڈر ہی نے بدلے حالات میں اپنے انٹرویو کے ٹیلی کاسٹ کو روکنے کی خاطر کروڑوں روپے خرچ کر کے اس کی فیچر میں رکاوٹ کے لیے جواز نام کا وائرس تو نہیں ڈالا ہے؟ پھر سوچ نے مشورہ دیا کہ اگر وہ لیڈر کا حصہ نکال کر فیچر کو پھر سے پری ویو کرانے کی کوشش کرلے تو شاید خواہ مخواہ کی منفی تنقید سے بچ پائے گا اور یوں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو پائے گا۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ از سرِ نو اپنے فیچر کی ایڈیٹنگ کر پاتا ایک خیال نے ہَوا کے جھونکے کی طرح اس کے پسینے سے شرابور ماتھے سے ٹکرا کر گویا ایک راز کی بات کہہ ڈالی۔ موم کے پَر لگا کر اونچی اُڑان کرنے والے نے سورج کی گرمی سے ڈر کر سورج پر گرہن تو نہیں لگا دیا ہے؟ سوچ لو! پھر اپنی کیسٹ جوں کی توں اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر وہ سحر کا انتظار کرنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ کل کے سورج پر گرہن نہیں لگا ہو گا اور اگر لگ بھی گیا ہو تو وہ گرہن کے ٹل جانے کا انتظار کرے گا!

OO

ٹوٹے کھلونے

ہم دونوں تقریباً چار دہائیوں کے بعد ملے ہیں مگر جانے کیوں یوں لگ رہا ہے جیسے کل بچھڑ کر آج ملے ہیں!--!!

یوں تو ہم جب بھی ملا کرتے تھے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر کہیں بیٹھ کر یا پھر چلتے چلتے، سنجیدہ اور غیر سنجیدہ باتیں کیا کرتے تھے اور پھر جب ہاتھ چھوڑ کر اپنے اپنے گھر یا اپنے اپنے کام پر جانے سے پہلے اپنے ہاتھوں کی حالت دیکھ کر پہلے پہلے مسکرا دیتے تھے اور بعد میں کھلکھلا کر ہنس پڑتے تھے کیونکہ وہ مضبوط گرفت کی وجہ سے نیلے رنگ کے ہوا کرتے تھے۔ ہاں مگر جس روز میری شادی ہو رہی تھی اُس دن سب سے نظریں بچا کر میرے گھر کی تنگ سیڑھیوں پر میں نے اُس کے شانوں کو اپنے سینے سے لگا کر کچھ کہے سنے بغیر الوداع کیا تھا۔ وجہ یہ کہ ہم دونوں پُرنم آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے جبکہ دونوں کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے مگر ہم بات کر نہیں سکتے تھے! مگر آج وہ جب خود میرے سینے سے لپٹ گئی تو مجھے یوں لگا گویا کسی نے میرے پکے پھوڑے کو اپنے لمس سے پیک نکال کر ایک شدید عذاب سے نجات دلائی تھی! حالانکہ میں نے اجنبیت کا اظہار کر کے اُس کو اپنے پلنگ کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا مگر وہ جب مجھ سے لپٹ کر رو پڑی تو میں بھی رو پڑا اور پوچھ بیٹھا کہ تم کو کیا معلوم تھا کہ میں چل پھر نہیں سکتا اور یوں بول سکتا ہوں کہ میرے اپنوں کے علاوہ بہت کم لوگ میری باتیں سمجھ پاتے ہیں تو وہ جذبات کی رَو میں بہہ کر درد بھری آواز میں بول کر پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

''کیا تم مجھے اپنا نہیں سمجھتے؟''

جواباً میں نے ایک اور سوال کیا۔

''کیسے ڈھونڈ لیا مجھے اس بڑے شہر میں، جہاں پاس پاس رہنے والے کو ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جان پاتے؟''

تو اُس نے میری امریکہ میں مقیم کزن کے گھر میری کتابیں دیکھ لی تھیں اور میرے ایک ٹی

وی سیریل کی سی۔ڈی دیکھ کر جب میرے بارے میں پوچھتا چھ کی تھی تب یہ جان گئی تھی کہ میں ایک بھیانک کار حادثے کا شکار ہو کر ایک اپاہج بن گیا ہوں! اُس نے جونہی یہ بتایا تو مجھے بیتے دنوں کی یادیں یوں تصویریں بن کر اُبھرتی ہوئی نظر آنے لگیں گویا دُھند میں جانے پہچانے چہرے نظر آنے لگے اور ایک پیارا سا چہرہ گنگنانے لگا۔

''محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تیری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے''

یہ چہرہ اُسی کا تو ہے اور جو مجھے یہ احساس دلا رہی ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تیری محفل میں آتو گئی ہوں یا ماضی کی حسین یادوں کی سوغات لے آئی ہوں:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

میں روز یہ دعا کرتا ہوں مگر محبّت کرنے والوں نے مجھ پر اتنے تیر چلائے ہیں جتنے کہ مہابھارت میں بھیشم پِتاما پر ارجن نے چلائے تھے۔ اور پھر وہ نیزوں کے پلنگ پر لیٹا نہ جی رہا تھا اور نہ مر رہا تھا۔ کیونکہ وہ کسی کی بدُعا کا شکار ہو گیا تھا۔ میں بھی کسی کی بددعا کا شکار ہو کر زندہ تو ہوں مگر یہ کیسی زندگی جی رہا ہوں! جس کی بدُعا مجھے لگ گئی ہے وہ خود آئی ہے مجھ سے ملنے! اگر میں معافی مانگ لوں گا تو کیا اِس عذابِ شدید سے نجات پالوں گا؟

ہم دونوں ایک محلّے میں رہتے تھے کبھی! میرا گھر دریا کے کنارے تھا جبکہ اُس کا گھر سڑک کے کنارے پر تھا، دونوں گھروں کے درمیان ایک لمبی گلی تھی۔ اُن کا مکان بہت بڑا تھا اور محلّے میں وہ واحد مکان تھا جس کی چھت ٹین کی تھی جبکہ ہمارے گھروں میں برسات میں چھوٹے بڑے برتن چھت کے نیچے اس لیے رکھے جاتے تھے تا کہ پانی کو جمع کر کے پھینک دیا جائے اور سردیوں میں ہر برف باری کے بعد برف اُتاری جایا کرتی تھی کہ کمزور چھتیں بوجھ سے گر نہ جائیں۔

اس کے والد تحصیل دار تھے جبکہ میرے والد ایک اسکول ماسٹر تھے۔ میری عمر بارہ برس تھی، جب میں نے اُس کو مندر کے احاطے میں سب لڑکیوں سے الگ پایا تھا، صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہنے ایک لڑکی میری شرارتوں اور باقی بچوں کے ہنسنے ہنسانے کے کارناموں میں ذرا سی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ کسی نے مجھے یہ بتایا تھا کہ اُس کے والد کی اسی شہر میں تبدیلی ہوئی ہے اور تقریباً دس سال بعد وہ اپنے گھر میں رہنے لگے تھے۔ اُس کے بعد جب ہمارا آمنا سامنا ہوا کرتا

تاہم دونوں کے چہروں میں لالی اُبھر آتی تھی اور میری بولتی بھی بند ہو جایا کرتی تھی۔ شروع شروع میں مجھ پر اپنے احساسِ کمتری کی وجہ سے ایک عجیب کیفیت طاری ہوا کرتی تھی مگر بعد میں ایک انوکھے احساس کا شکار ہو کر جونہی میں اُس کو گلی میں آتے جاتے یا اپنے دروازے پر کھڑی دیکھ لیا کرتا تھا تب میں راستہ بدل دیا کرتا تھا۔ ایک دن ہوا یوں کہ میری ماں نے مجھے نانا جی کے گھر لے جانے کی خاطر مندر میں پوجا کرنے کے لیے اپنے ساتھ لیا تھا۔ وہ اس لیے کہ اُن دنوں بسوں کو لاری کہا جاتا تھا جو تیس میل کا سفر پانچ گھنٹے میں طے کیا کرتی تھی پھر لاری میں سواریاں اتنی ہوا کرتی تھیں کہ جہاں چھ سواریاں بیٹھ سکتی تھیں وہاں دس سواریوں کو فٹ کیا جاتا تھا اور پھر اور سواریوں کے لالچ میں لاری بار بار رُک جایا کرتی تھی۔ پھر سواریاں اُلٹیاں کر کے ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتی تھیں یعنی سفر گویا ایک معرکہ ہوا کرتا تھا اس لیے تیاریاں کرنے کے بعد ہی سفر طے کیا جاتا تھا۔ اُس روز اپنی بہت ہی تیز مزاج والی ماں کے حکم پر مندر میں موجود لوگوں کو پرشاد دینے کی ذمے داری سنبھالتے ہوئے اپنے باتونی پن اور مسخرے پن سے ہنستا ہنساتا جب اس کو پرشاد دینے گیا تھا تب گھبرا کر میں نے تھالی اُس کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی اور بھاگ گیا تھا نتیجتاً ماں کو سفر ملتوی کر کے میری خوب پٹائی کرنی پڑی تھی۔ اور جب محلے والوں کو یہ خبر ملی تب وہ ہمارے گھر آئی تو تھی مگر مجھے دیکھ کر وہاں سے کھسک گئی تھی۔ اچھا کیا تھا ورنہ شاید وہ میری چغلی کر کے مجھے اور پٹوا دیتی۔

ایسا میں نے تب سوچا تھا کیونکہ بعد میں یہ جان گیا تھا کہ وہ میرے بارے میں فکر مند تھی۔

مگر یہ جان کر بھی ہم دونوں کے چہرے چاہت کی آنچ سے آمنا سامنا ہوتے ہی لالہ رُخ پھول جیسے نظر آیا کرتے تھے لیکن یہ منظر ہم دونوں کے علاوہ اُس کی سہیلی اور میری منہ بولی بہن شمع دیکھا کرتی تھی، اُس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوا کرتی تھی تب ہم آنکھوں آنکھوں میں کچھ ایسے سوالات کیا کرتے تھے جو ہمیں خود بھی معلوم نہیں تھے۔

ان باتوں کے بارے میں جب ہم چند سال گزرنے کے بعد بات کیا کرتے تھے تب ایک ساتھ بولتے رہتے۔ ''ہم نے ایک دوسرے کے لیے ہی جنم لیا ہے۔''

ہم دونوں ایک ساتھ تب بیٹھے تھے جب سردیوں کی چھٹیوں میں ایک ہی استاد کے گھر ایک گروپ میں پرائیویٹ کوچنگ لے رہے تھے۔ ہم دونوں کی عمر پندرہ یا سولہ برس تھی اور ہمارے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں چھ لڑکوں کے ساتھ چار لڑکیاں بھی پڑھائی کرنے آیا کرتی

تھیں۔لڑکیاں ایک ساتھ بیٹھ تو جاتی تھیں لیکن کوئی نہ کوئی لڑکی کسی نہ کسی لڑکے کے ساتھ چمٹ کر بیٹھنے کے لیے مجبور ہو جایا کرتی تھی۔شمع چونکہ منہ پھٹ تھی اور سب کو 'بھائی' بنا چکی تھی اس لیے تو وہ رانی ہوا کرتی تھی جو کسی لڑکے کے سہانے لمس سے گھبرا نہیں جایا کرتی تھی۔اپنا دفاع ایک مزاحیہ انداز میں کیا کرتی تھی کہ مجھ سے پیار کرو مگر ایک بھائی بن کر ورنہ فسادات کی شروعات اس گلی سے ہو جائے گی۔

شمع بہت خوبصورت تھی مگر وہ تو اُس سے بھی سندر تھی۔دونوں سہیلیوں میں ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جایا کرتا تھا کہ اشاروں ہی اشاروں میں خوب باتیں کیا کرتی تھیں۔اُس زمانے میں پہلی ہی نظر میں پیار ہو جانے کے قصے کہانیاں لڑکوں بلکہ لڑکیوں کے کھسر پھسر موضوعات ہوا کرتے تھے۔دراصل کو ایجوکیشن کے عدم کی وجہ سے جب بھی کوئی خوبصورت یا بدصورت لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ شروع کر دیتی تھی تو دونوں سمجھ بیٹھتے تھے کہ محبت ہوگئی ہے! کیونکہ وہ کسی سے بات ہی نہیں کرتی تھی اس لیے دل جلے لڑکے اُس کو ایک مغرور امیرزادی سمجھ کر کچھ پوچھنے کی نہ ضرورت سمجھتے تھے اور نہ ہمت کرتے تھے!!

ایک دن وہ میرے ساتھ چپک کر بیٹھی تھی۔میرے بدن پر گویا چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔میں اُٹھ کر کہیں اور بیٹھ جاتا مگر اس سے پہلے کہ میں ساتھ بیٹھے لڑکے کو اپنی جگہ سے کھسکنے کے لیے التجا کرتا میرے بالکل ٹھنڈے پاؤں پر اُس کا پشمینے کا شال پڑتے ہی گویا یہ کہہ گیا تھا کہ تم کیوں مجھ سے دُور جانے کی کوشش کر رہے ہو؟ کیوں؟؟

پھر ہم روز ساتھ ساتھ بیٹھ کر بھی ایک دوسرے سے بات نہیں کیا کرتے تھے بلکہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کیا کرتے تھے۔

اُس کی سنجیدگی نے مجھے بھی سنجیدہ بنا لیا تھا۔اور پھر تبدیلی دیکھ کر اکثر اُس کے چہرے پر خوشی کی جھلک نظر آیا کرتی تھی جو شمع دیکھا کرتی تھی۔پھر ایک روز اُس نے مجھ سے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہا۔"دیکھو بھائی تم جب سے ایک مسخرے کی بجائے ایک سنجیدہ طالب علم بن گئے ہو، تمھیں اپنا جیون ساتھی بنانے کو جی چاہتا ہے مگر تم ہندو ہو اور میں مسلمان!اس لیے تم سچ مچ میرے بھائی بن جاؤ۔اور تم بیوی کسی اور کو بنالو!کسی اور کو کیوں، اُس کو کیوں نہیں جو تمھیں اپنا محبوب سمجھتی ہے۔"

"یہ سن کر سب لڑکے لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے مگر وہ خاموشی سے ایسی بات پر ہنسنے

والوں کو یوں دیکھتی رہی گویا وہ اُس کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر ہنس رہے تھے۔ ایسا میں نے تب سوچا تھا اور اگلے لمحے اِس قصّے کو دیوانے کا خواب سمجھ کر بھول گیا تھا۔

اُس روز جب ہم اپنے اپنے گھر جا رہے تھے تب اُس نے مجھ سے کہا تھا۔ ''تم بہت ذہین ہو۔ تم مجھے اپنے بنائے ہوئے نوٹ دیا کرو اور مجھ سے میرے نوٹ لیا کرو۔ دونوں کے نوٹس ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہم دونوں کو یونیورسٹی میں پہلی دس پوزیشنوں میں دو اہم پوزیشنز دلا سکتے ہیں۔''

میں نے اس کی پہلی بار کہی باتوں کا جواب سر ہلا کر دیا تھا۔ وہ بہت ذہین تھی اور اُس کے بنائے ہوئے نوٹس میرے لیے اتنے مفید ثابت ہوئے تھے کہ اُس کی میٹرک کے امتحان میں پانچویں پوزیشن آئی تھی اور میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ جس روز ہمارا رزلٹ آیا تھا اُس شام ہم اُن کے ہی گھر میں ہو رہی محلے کی ایک لڑکی کی شادی کی تقریبات میں یوں ملے تھے گویا ہمارا ملن طے شدہ تھا۔

اُن دنوں کشمیر میں شامیانے لگا کر شادیاں کرنے کا رواج نہیں تھا۔ محلے والے تحصیلدار صاحب کے مکان میں ہی شادی کی تمام تقریبات سرانجام دیا کرتے تھے جہاں ایک ہال نما کمرے میں محلے کی عورتیں کشمیری لوک گیت گا رہی تھیں وہاں کچھ جوان مرد، عورتیں، لڑکے لڑکیاں فلمی گانے گا کر جھوم جھوم کر ناچ رہے تھے۔ وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کچھ کہے بغیر کھینچ کر اُس کمرے میں لے گئی اور وہاں یہ اعلان کر دیا کہ میں ایک گانا سناؤں گا۔ میں شاید گا نہیں پاتا اگر وہ میری ڈوب رہی سانسوں کو سہارا نہ دیتی۔ ایسا چند لمحات کے لیے ہوتا رہا پھر نہ جانے کس کی روح کس میں داخل ہو کر ہم دونوں کو ایک کے بعد دوسرا دوگانا گانے کے لیے اُکساتا رہا! وہاں موجود لوگوں میں شمع بجھی تھی اور وہ تالیاں بجا رہی تھی جبکہ میں حیران تھا کہ اچانک یہ چشمے کا پانی کیوں اور کیسے اُچھل اُچھل کر رواں دواں بہہ کر جل ترنگ بجانے لگا تھا۔ اُسی رات شاید ہماری ایک دوسرے کے لیے چاہت کا بیج اپنے اوپر اوڑھی ہوئی مٹی کی چادر ہٹا کر ایک پودا بن گیا تھا۔ پھر خیالات و جذبات اور احساسات کی ہم آہنگی نے پودے کی آبیاری کی تو پودے نے چار سو محبت کی خوشبو پھیلا کر دو محبت کرنے والوں کی نہ صرف پذیرائی کی بلکہ قدم سے قدم ملا کر زندگی کا سفر طے کرنے کے لیے حوصلہ افزائی بھی کی تھی!

ہم کالج ساتھ جایا کرتے تھے، لائبریری میں گھنٹوں بیٹھ کر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ جھیل

کے کنارے بیٹھ کر مشاہدہ کرنا ہمارا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھار تحصیلدار صاحب مفت پاس دیا کرتے تھے تو ہم دونوں فلمیں بھی دیکھا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں فلمیں دیکھنا ایک عیب سمجھا جاتا تھا مگر تب بیشتر ناظرین ہیرو یا ہیروئن کی جیسی جوڑی بن جانے کی تمنا کرتے تھے جبکہ آج کل فلمیں دیکھنا عیب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ نوجوان طبقہ اپنے پسندیدہ کلا کاروں کو بھوکے کتوں کی طرح نہیں دیکھا کرتے تھے۔ والدین اور بچوں کے درمیان جوڑر کی کھائی ہوا کرتی تھی وہ دراصل ایک ایسی ندی تھی جس کو پار کرنے کی خاطر پیار و محبت کشتی اور چپو کا کام کیا کرتے تھے یعنی آج کل کی طرح دوستی نہیں ہوا کرتی تھی جو اکثر کار بد کرنے والوں کو جھوٹ بولنا سکھا دیتی ہے۔ ہم دونوں تحصیلدار صاحب کی فراخ دلی کی وجہ سے تب اور اب دونوں کے درمیان کھڑے ہو کر کبھی کسی کو کوئی بدبودار کہانی سوچنے کا موقع نہیں دیا کرتے تھے کیونکہ ہمارا پیار ایک غنچے سے پھول بن گیا تھا؟ خوشبودار!!

ہم نے جو آخری فلم ایک ساتھ دیکھی تھی وہ دلیپ کمار والی ''دیوداس'' فلم دیکھنے کے بعد پہلی بار ہم دو پیار کرنے والوں کی طرح بے وفائی، رسوائی، جدائی اور بربادی کے بارے میں سوچتے سوچتے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام، چلتے چلتے اپنی گلی کو دیکھے بغیر شہر کے حدود سے باہر چلے گئے تھے پھر ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ دیوداس کو اپنی پارو کو لگن منڈپ سے مہاراجا پرتھوی راج چوہان کی طرح اپنی سنجوگتا کو اُٹھا لے جانا چاہیے تھا یا پھر لیلیٰ مجنوں کی طرح عشق کی انتہا کو چھو لینے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔

اُن ہی دنوں کالج کے میگزین میں میری پہلی کہانی چھپ گئی تھی اس لیے ہم دونوں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ ہم دونوں میں کوئی قلم کار یا فلم کار بن گیا تو ہم ایسی کہانیوں کی مخالفت کریں گے جو وجہ نفرت ہوں! کشمیر میں آزادی سے پہلے شخصی راج تھا اور اُس دور میں ڈاکٹر اور انجینئر وہی ہندو یا مسلمان بن جایا کرتے تھے جو امیر تھے۔ مگر عوامی راج میں غریب لڑکے بھی تعلیمی قرض لے کر پڑھائی مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یعنی کلرکوں، استادوں، چپراسیوں اور کسان کے بچے بھی ٹریننگ پر جا سکتے تھے۔

اپنی قابلیت پر ایک انجینئرنگ کالج میں داخلہ اور بلا سود قرض لینے میں مجھے اس کے باپ نے بہت مدد کی تھی جبکہ اپنی بیٹی کو ٹریننگ پر نہ بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے میرے ساتھ اپنی ماں کی طرح ایک گرہستن بن جانے کے حسین خواب دیکھے تھے۔ یہ اہم بات اُس نے مجھے اُس دن

بتا دی تھی جس دن میں ٹریننگ کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ اُس دن بھی اس نے اپنے ہاتھ میں ہاتھ یوں لے لیا تھا گویا ایسا کرنے سے راہ میں چراغ جل کر میرے سفر کو سہل کر دیں گے۔ اُن دنوں معاشرے نے ایک ایسی کروٹ لی تھی کہ بہت امیر لوگ اپنی بیٹیوں کے لیے ایسے غریب لڑکے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ وہ تفصیلات سرکاری وسائل سے حاصل کر کے غریب والدین کے گھروں میں ایک چمتکاری سوداگر بن کر گھس جایا کرتے تھے اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کا پورا بندوبست کر کے ہی نکلتے تھے۔ ایسے ہی ایک سوداگر نے میری ضدی ماں سے میرا سودا طے کیا تھا۔ حالانکہ میں نے جاتے وقت شمع بہن کو یہ کہا تھا کہ موقع ملے تو ماں کو میری پہلی پسند اور خواہش کے بارے میں کہہ دے۔ مجھے ماں کی بیماری کی جھوٹی خبر دے کر سری نگر بلایا گیا تھا۔

وہ کہانی بھی ایک افسانہ بن کر میری تکلیف دِہ زندگی کا ایک حصہ بن گئی ہے۔

میں رات کی ٹرین سے دہلی کے ریلوے اسٹیشن پہنچا تھا تب ایک اجنبی نے اپنے ہاتھ میں میری تصویر لے کر مجھے پہچان لیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں وہی تصویر تھی جو میں نے اپنے گھر والوں کے لیے کالج کی مخصوص پوشاک میں کھنچوائی تھی۔ اس لیے جب اُس نے مجھ سے اُس کے ساتھ چلنے کے لیے التجا کی تب میں انکار نہیں کر سکا تھا۔ باتوں سے بات نکال جب میں یہ جان گیا کہ میری جان کے والد تحصیلدار سے ڈپٹی کمشنر بن گئے ہیں تو یہ سمجھ بیٹھا کہ ہوائی سفر اُن کی ہی عنایت ہوگی مگر گھر پہنچا تو مجھ پر پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا! جو شخص مجھے اپنے ساتھ ہوائی جہاز میں لایا تھا وہ میرا ہونے والا سالا تھا۔ مجھے اپنی ماں پر سخت غصہ اور اُس پر ترس آیا تھا۔ میں چیخا تھا چلاّیا تھا مگر بینڈ باجے کی آواز نے میری صداؤں کو دبوچ لیا تھا۔ میری ہمدرد بہن شمع نے کہا تھا کہ اُس نے میری ماں سے بات کی اور وہ مان بھی گئی تھی مگر بعد میں وہ جہیز کے لالچ میں آ گئی تھی۔ مجھے اپنی ماں سے نفرت ہو گئی تھی حالانکہ میں نے خاندان کے وقار کی خاطر اُس کے سامنے ہمیشہ فرماں برداری کا سوانگ رچا تھا! جس دن میں دولہا بنا تھا اُس دن وہ مجھ سے ملنے آئی تھی مگر اُس نے نہ کوئی گلہ کیا تھا نہ شکوہ یا شکایت کی تھی، بلکہ میں نے اپنی صفائی پیش کی تھی۔ کیونکہ ہم نے بہت پہلے محبت کے خطوط اور اپنی پاک محبت کے چھچھورے پن کے مظاہرے نہ کرنے کی قسم کی کھائی تھی اس لیے ہم دونوں کی باتیں دل میں ہی رہ گئی تھیں۔ پھر جب میں چھٹیوں میں گھر آیا تھا تو گلی میں چکّر لگاتے ہوئے شمع نے بتایا کہ وہ امریکہ گئی ہے اور کسی کو بھی کچھ کہے بغیر، مگر سنا ہے علاج کے لیے گئی ہے۔

پھر جب میں ٹریننگ مکمل کر کے گھر لوٹا تھا تب میرے سسر نے ہمارے لیے ایک نیا گھر

ایک نئی کالونی میں خرید لیا تھا بلکہ وہ کار جو چھوٹا بھائی چلا رہا تھا وہ بھی ہماری ہے۔ میں اپنے پرانے محلّے گیا تو شمع نے بتایا تھا کہ اُس کا باپ بھی اپنی اِکلوتی بیٹی کے پاس چلا گیا تھا اور اپنے من مندر میں کرشن کو بٹھا کر میرا نے امریکہ کے کسی راج کمار سے شادی کر لی تھی۔

آج اپنی میرا کو دیکھ کر ایک سوال کا جواب ملا ہے جو سوال مجھے قریب سے جاننے والے میرے دوست احباب بلکہ میری بیوی بچے، رشتے دار، ناطے دار میرا حال بد دیکھ کر مجھ سے پوچھتے رہتے ہیں وہ یہ کہ میں نے جب کسی کا دل نہیں دکھایا ہے تب مجھ جیسے آدمی کو یہ سزا کیوں؟

میں سوچ رہا ہوں کہ آج سب کے سامنے یہ بول دوں کہ میں نے اس عورت کا دل دکھایا ہے۔ جب یہ ایک معصوم پاکیزہ لڑکی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ پاتا میرا بول پڑی کہ اگر کسی معصوم کی آہ کسی کو لگ جاتی ہے تو میں اس عمر میں یہ مان لیتی ہوں کہ اگر جھیل کے کنارے بیٹھ کر بھی عمر بھر پیاسی رہی ہوں تو اس عظیم انسان کا دل دکھا کر اس کے دل سے نکلی آہ کی وجہ سے شاید...!

میرے پاپا چاہتے تھے کہ میں ان کے دوست کے ڈاکٹر بیٹے سے شادی کر لوں مگر میں نے اپنی ماں کو منا لیا تھا کہ میری شادی میری پسند پر کی جائے۔ لیکن جب تمھاری ماں، جو محلّے میں بدکلامی کے لیے بدنام تھی، میری ماں سے میرا اور کرشن کے رشتے کی بات کرنے آئی تھی تو اُن کے شائستہ کلام کو میرے، بہت ہی نرم لہجے میں باتیں کرنے والے پاپا نے، اپنی بدکلامی سے، اس قدر بے عزت کیا تھا کہ وہ سمجھ گئی تھی کہ ایک اسکول ماسٹر کی بیوی کو محلوں کے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ اور میں اپنی سنسکرتی کے دائرے میں رہ کر کچھ بھی نہ کر سکی!

ہاں مگر ایک وفادار محبت کرنے والے سے جفا کر بیٹھی! میری شادی ہوئی تھی مگر میرا پتی سہاگ رات کو ہی ایک برقی جھٹکے کے حادثے کا شکار ہو کر میری مانگ کے سیندور کو راکھ میں بدل گیا تھا!! بقول اُس کے یہ سب اس لیے ہوا کہ اُس نے ایک سچے عاشق کا دل توڑا تھا۔ میں لرز اٹھا۔ تو کیا میری ماں بے قصور تھی؟ دل میں ایک ہوک سی اُٹھ گئی تو میں نے میرا سے پوچھا کہ وہ کرشن کے پاس لوٹ کر کیوں نہیں آئی۔ وہ چند لمحات کے لیے ویسے ہی خاموش رہی جیسے وہ غیروں کے سامنے رہا کرتی تھی مگر اُس کے لب تھرتھرانے لگے اور بادلوں کی طرح پھٹ گئے۔ آنسوؤں کا سیلاب جب بہنے لگا تب وہ بول پڑی، کیسے آ سکتی تھی دیوداس! پارو کا پتی اپنی اِکلوتی اولاد اُس کو جو سونپ گیا تھا!

یہ کہہ کر وہ شاید جانا چاہتی تھی مگر میں نے اِس بار نہ صرف اُس کا ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا بلکہ اپنی بیوی بچوں اور پوتوں کے سامنے کھینچ کر اس کو اپنے سینے سے لگا کر یوں روتا رہا، جیسے ایک ضدی بچے کو مشکل سے اپنا کھویا ہوا بہت ہی پیارا کھلونا مل تو گیا ہو مگر ٹوٹا ہوا! دراصل ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ٹوٹے کھلونے تھے!

میری ماں جس کو میں قصوروار سمجھ کر اکثر ذہنی تکالیف دیا کرتا تھا، اگر آج زندہ ہوتی تو دو ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو دیکھ کر بوکھلا کر اپنی بدکلامی سے نفرت کا تاثر چھوڑتی یا رو کر ہم دونوں کے لیے اپنے پیار کا اظہار کرتی!!

OO

کوئی تو بتادے؟

ایک سال پہلے میں چھ ماہ کے عذاب دہ سفر کے بعد اسی جگہ آسمان سے زمین پر اُترا تھا۔ اور یہیں کھڑا ہوں!!

تب سے اب تک نہ ہی حالات بدلے نہ کسی بھی قسم کے واقعات رونما ہوئے۔ نہ کہیں صیاد کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور منعکس چیتے کے تیز رفتار قدموں کی پرواز کی سطح پر نشان اور نہ کہیں برف پر گر چکے ہرن کے خون کے نشان! نہ سرحدوں پر فوجی بن کر (Bunkar) اور نہ کوئی فوجیوں کی چہل پہل!

نہ آسمان میں طیاروں کی چیرتی ہوئی آواز سنائی دے رہی ہے اور نہ فوجی ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی ہے بلکہ برفیلے پہاڑوں میں نہ چیتے کے قدموں کے نشان نظر آرہے ہیں اور نہ ہرنی کے خون سے رنگے برف کے تودے نظر آرہے ہیں۔

تب سوچا تھا کہ اگر جاڑے کی نرم دھوم سے میرا برف کا لبادہ مکمل کر مجھے پانی کا لبادہ نہیں پہنا سکے گی تو گرمیوں کی شدت دُھوپ میں برف کو سما کر میری مشکل حل کردے گی!

مگر ایسا بھی نہیں ہوسکا تھا!

آس پاس برف کی چادر دُھوپ میں چمکتی رہی ویسے ہی جیسے سردیوں کی روپہلی روشنی میں چمک رہی تھی۔

سال بھر نہ کوئی چلتا پھرتا جاندار نظر آیا اور نہ صدیوں سے پانی کی بوندیں زمین کی عمیق گہرائیوں سے چوس کر حیات پانے والے سر بہ فلک چنار کے درخت بھی نظر نہیں آئے کبھی!

پہلے پہلے یوں محسوس ہوتا رہا کہ زمین لحاف اوڑھ کر سو رہی ہے!

ایک ریچھ کی طرح جو کسی غار میں چھ مہینے کچھ کھائے پئے بغیر سویا پڑا رہتا ہے!

یا پھر ایک چیونٹی کی طرح زمین دوز گھر بلکہ اپنی الگ دنیا بسالیتی ہے!

بعد میں یوں محسوس ہوتا رہتا تھا کہ ایک ہی کفن اوڑھ کر زمین ویسے ہی دفن ہو چکی ہے جیسے

پچھلی صدی میں ایٹم بم گرنے کے بعد ہیروشیما اور ناگاساکی کے شہر راکھ کا کفن اوڑھ کر خاکِ سیاہ میں دفن ہو گئے تھے۔

کیا یہ اٹوٹ ڈراؤنی خاموشی اُسی عبرت ناک سانحے کی یاد دلا رہی ہے؟

یا پھر کسی بھیانک طوفان کے آمد کی اطلاع دینے والی پُر اسرار خاموشی ہے؟

سوچ سائبیریا (Siberia) کا حوالہ دے کر سمجھا رہی ہے کہ کہیں میں اس بار سائبیریا میں ہی تو نہیں گرا دیا گیا ہوں؟

سمجھ مشاہدے کے تعلق سے دُور دُور تک اِگلو (Igloo)، سفید رنگ کے برف پر چلنے والے اور برف کی موٹی تہیں کاٹ کر برف کے نیچے بہہ رہے دریا سے مچھلیوں کا شکار کرنے والے ریچھ یا اسکیموں (Eskimo) کو شکار کرنے والے، کتّوں سے اپنی گاڑیاں نظر نہ آنے کی وجہ سے یہ ثابت ہو چکی تھی کہ میں انٹارٹکا (Antartica) کے علاقے میں بھی موجود نہیں ہوں۔ کیونکہ وہاں نیوکلائی تحقیق اور تخلیق کرنے والے سائنس داں محفوظ پوشیدہ جگہوں میں رہنے کے سبب نظر تو آئیں گے نہیں مگر لاکھوں پینگوئینز (Penguines) تو نظر آ جاتے۔

سوچ اور سمجھ کے تضاد ہمیشہ عمل کو اُلجھاتے ہیں اس لیے میں زیادہ توجہ پُر اسرار خاموشی پر مرکوز رکھ کر فقط خدشات کو ایک بے قابو ہاتھی کی طرح اپنی خواہشات کو مسلتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں!

آخر کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ اور کیسے ہو رہا ہے؟

کوئی تو بتا دے؟

دنیا بنانے والے کی طرح میں بھی زمین سے آسمان دیکھ سکتا ہوں۔ آفتاب، مہتاب، سیارے اور ستارے دیکھ سکتا ہوں مگر زمین اور آسمان کے درمیان موجود ہوا دیکھ تو سکتا ہوں مگر اپنی بدلتی ہوئی کیفیتوں کی وجہ سے کبھی راحت، کبھی چاہت، کبھی نحوست، کبھی محبت، کبھی بدل رہی کروٹ سے عذاب بلکہ عتاب سے محسوس کر سکتا ہوں۔

مگر دنیا بنانے والے کو نہ دیکھ سکتا ہوں اور نہ کبھی ہوا کی طرح چھو کر محسوس کر سکتا ہوں۔ جبکہ میں آسمان سے دنیا بنانے والے کی طرح زمین کو دیکھ سکتا ہوں۔

مخلوقِ خدا کی آہ اور واہ کو دُور ہو کر بھی یوں محسوس کر سکتا ہوں گویا پاس ہوں بلکہ سب کا ہم نفس ہوں، ہم راز ہوں!

درد آشنا ہو کر بھی کی شدتِ درد سمجھ سکتا ہوں!

دنیا بنانے والا بھی اپنی مخلوق کی جسمانی اور ذہنی کیفیت بھانپ لیتا ہوگا!

اور جو میں نے پچھلی برسات کے موسم کے آغاز میں آسمان سے زمین کو اکھڑتے اور مخلوق کو اُجڑتے دیکھا تھا وہ قہر آلود منظر اسے بھی دیکھا ہوگا!

زمین کے شدتِ درد اور مجھ بے زبان کے شدتِ کرب کو محسوس تو کیا ہوگا؟

وہ تو بول سکتا ہے! پھر کیوں نہیں بول پڑا؟

جب میں چھ مہینے کے دوران ایک بھٹک رہی روح کی طرح، بادل کا لبادہ پہن کر، بارش یا برف کا لبادہ پہن کر زمین پر اُترنے کی کوشش میں اپنی بے تابی اور بے قراری کو اپنے سینے میں بے بسی کی آگ میں دباتے ہوئے کرب کو محسوس کرتا رہا تب اس نے میری مدد کیوں نہیں کی تھی؟

مجھ سے نہ سہی، سحر کے اُبھرتے اور پھیل رہے اُجلے دائروں سے بوقتِ شام لال رنگ کے سکڑ رہے، لال دائروں کو شمع کی لو کو تاریکیوں میں ڈوب جاتے دیکھ کر جبین زمین پر رکھ کر بارہا عبادت کرنے والوں اور آسمان میں گھور گھور کر یا آنکھیں بند کر کے اپنی پارسائی کا دعویٰ کرنے والے منتروں کی پاکیزگی سے دنیا بنانے والے کی شناسائی اور پھر رسائی کا یقین دلانے والے پرستش کرنے والوں کو اپنے احساسات اور محسوسات کا ذکر کرتے!

میں نے ان پہاڑوں پر فرشتوں کو تم سے باتیں کرتے ہوئے سنا ہے!

تمھاری آواز سنے بغیر ان کے سوالوں کے تسلسل سے تمھارے جوابات سن کر یہ جان گیا ہوں کہ زمین پر جنم لے کر سونے والے ہر جاندار کو زندگی کا سفر طے کرنے میں تو ہی تو ہے۔ یعنی ازل سے ابد تک کا سفر طے کرنے والی قوت تو ہی تو ہے جو لبادہ پہننے سے لبادہ اُتارنے تک کا معیاری سفر طے کرتا ہے۔

گویا ہر جاندار میں تم رہتے ہو یا پھر تمھارا جز ہے۔!

میں بھی بھاپ سے بادل اور پھر بادل سے بارش اور برف بن جانے کا ہر سفر جن لبادوں میں طے کرتا ہوں اُن میں تم بیٹھے ہوئے ہو!

اگر یہ سچ ہے تو جب میں کارواں سے بچھڑ کر اپنے ہم نفس ہم نوا ساتھیوں کو آگ کا دریا بن کر تمھاری زمین کو اکھاڑ کر اجاڑ گیا تھا تو مجھے اس قہر آلود سانحہ کا واحد گواہ مان کر میرا بیان امر کر کے خود ہی وضاحت اور وکالت کر کے، خود ہی منصف بن کر اپنے اُن ذرّوں سے، تمھاری ہی عنایت

کی ہوئی تخلیقی قوت کو واپس کیوں نہیں لیتے جو انقلابی بن کر زندگی کے سفر کو خوشگوار بنانے کی بجائے انتہا بن کر تمھاری زمین کو بیابانوں میں بدل رہے ہیں۔

وہ منظر تو دیکھا ہو گا تو نے؟

پھر اس خاموشی کو توڑ کر مجھے میرا لبادہ بدلنے میں مدد کیوں نہیں کرتے؟

اچانک تمھارے آفتاب میں وہ تپش کہاں گئی جو برف کو دُھوپ میں سما کر مجھے پانی کا لبادہ پہنا کر ایک معمول کا سفر طے کرنے میں میری مدد کر سکتی!

تم مجھے بتاتے نہیں؟

سوچ سمجھاتی رہتی ہے کہ دنیا بنانے والا اپنی تفریح کے لیے کھیل کھیل رہا ہے!

وہ تمھاری طرح مجبور نہیں ہے بلکہ مختار ہے۔ جو ہو چکا ہے یا ہونے جا رہا ہے، ہونے دو! سمجھ بتا رہی ہے کہ کچھ تو ہوا ہے جو زندگی کے رنگ اور رُوپ کو برف میں قید کیا ہے۔ بیج اور لبادہ بدل کر پودے کا لبادہ پہن کر بود نہ ہو جائے تو نہ جنگل ہوں گے نہ بوستاں ہوں گے، نہ گلستاں ہوں گے، نہ کھیت ہوں گے اور نہ فصل ہوں گی۔

اے آسمان پر رہنے والے فرشتو! کیا تم زمین کا دردناک مناظر دیکھ چکے ہو؟ سن لو میری کہانی میرے شدتِ کرب کی زبانی۔

میں پچھلے سال معلوم نہیں کیوں، اپنے ہم سفر بادل کے ٹکڑوں کے ساتھ برف کا لبادہ پہن کر موسم سرما کے اختتام پر زمین پر آ تو گیا تھا مگر پگھل کر سیلاب کی شکل اختیار کر کے زمین پر اپنے سفر کا آغاز کر چکا تھا۔

میں خشک سالی کی وجہ سے ایک تالاب میں رُکا رہا تب تک جب تک تالاب کی تہہ سے بلبلے پھیلنے لگی۔

جوں توں میں بھاپ بن کر آسمان میں بادل کے ٹکڑے، جو سمندر سے آگے بادلوں کے ٹکڑوں کو دُور سے دیکھتا رہا — اور ان کے کاروان میں شامل ہونے کی خاطر دوڑتا رہا۔ دوڑتے دوڑتے میں اپنی دوربیں نظریں زمین پر جما کر دو بوند پانی کے لیے ترس رہی زمین، جو شدت کی گرمی سے مرجھا کر اپنا رنگ کھو چکے تھے اور مٹی کی بدبو سے اپنی خوشبو کے بارے میں خدشات کے شکار ہو کر، جھک کر اپنی آخری سانس کا انتظار کرتے کرتے اچانک آسمان میں تیر رہے بادلوں کو دیکھ کر اپنی خواہشات کے عکس دیکھ کر بادلوں کی تاثیر مسیحائی کی محبت کی خوشبو سے پذیرائی کرتے

رہے!

بادلوں کے ٹکڑے ایک ہونے کی خاطر جب ایک دوسرے سے بغل گیر ہوکر گرج کی آوازیں پیدا کرتے تھے تو اشرف المخلوق انسان، دہقان، باغبان اور خوشحالی کے پاسبان یوں نظر آتے رہے گویا وہ راگ میگھ ملہار کی سرگم کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر اپنی ڈفلی کی دھنک سن رہے ہوں!

کویل اور دوسرے پرندوں کی چہک کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر ہواؤں سے جھوم رہی شاخوں کی لچک، پتوں کی چھنک اور دُور دُور تک پھیلے کھیتوں کی لہک دیکھ سن کر!

اور بارش کے بعد سرسبز ہوتی گھاس پر پکھراج کے مانند پانی کے قطروں کی چمک! گیلی مٹی کی چار سو پھیلی مہک سے موسم کی پہلی برسات کی دھنک!

میں یہ سوچ رہا تھا جب میرے تصورات کا تسلسل ایک یلغار سن کر ٹوٹ گیا۔

گرج سے پیدا ہونے والی سُریلی آواز کے ساتھ کسی شادیانے میں ہو رہی آتش بازی کی ہم شکل بجلیوں کی بجائے آسمان سے ایک آگ کا دریا، زمین کو یوں اکھاڑ گیا تھا گویا ایک انقلابی کا، ایک دریا پر، ایک اونچے مضبوط باندھ کے پیچھے ایک بہت بڑی جھیل کا پُر سکون پانی، باندھ کے اُڑ جانے کی وجہ سے ہزاروں مست ہاتھیوں کی طرح جنگلوں، بوستانوں، گلستانوں، کھیتوں اور بستیوں کو روند کر زیر آب کر گیا۔ جو تھا آباد اُسے مسمار کر گیا—!

یہ تب ہوا تھا جب ایک نیوکلیائی گولا باریوں کو یوں دبوچ گیا تھا گویا ایک اجگر ایک حاملہ بکری کو نگل کر ڈکار لے رہا تھا۔

زمین چپ ہوگئی تھی اور آسمان میں بھی سناٹا چھا گیا تھا۔ اور میں ایک طوفان میں کھو چکے بچے کی طرح ماں کی تلاش میں بھٹکتا رہا!

ایک کولھو کے بیل کی طرح میں ایک گردانی دائرے کے محیط پر چلتا رہا۔

دل شکستہ سفر کے دوران لمحے میرے ہم سفر تھے مگر ایک لمحے کی زندگی کا سفر، پانی کے ایک بلبلے کی طرح بود کے ساتھ ہی نابود ہونے تک ختم ہو جاتا ہے اس لیے ہر لمحہ مجھ سے مل کر بچھڑ کر وقت کے کارواں کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ میرے حالات زار کو بھول کر۔

کاش دنیا بنانے والے نے وقت کو زبان دی ہوتی تو جو گزر چکا، اچھا یا بُرا، وہ صدیاں گزرنے کے بعد آثارِ قدیمہ کے حوالوں سے موہن جو داڑو کے کھنڈروں کی زبانی منوہری کی عشق کی داستان جانتے۔ بلکہ یہ بھی جان پاتے کہ دنیا کی ایک بہت بڑی جھیل کی تہہ میں ایک عالیشان شہر

ڈوب چکا تھا۔

جن رشی منیوں سے میں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر ان کے تبادلہ خیالات سے جو جانکاریاں حاصل کی تھیں وہ آج یاد آ رہی ہیں۔

مثلاً میں ایک روح ہوں جو جس لبادے میں ڈالی جائے وہی نظر آتی ہے!

لبادہ پہن کر جنم ہوتا ہے اور لبادہ ایک طے شدہ سفر طے کرنے کے بعد خود بخود اُتر جاتا ہے یا اُتار کر نیا لبادہ پہنایا جاتا ہے!

کب اور کیسے یہ دنیا بنانے والے کی اپنی منصوبہ بندی ہوا کرتی ہے۔

جو بھی روح سفر پورا کرنے سے پہلے لبادہ چھوڑ دے یا سفر پورا کرنے کے بعد لبادہ اُتارنے میں کامیاب نہیں ہوتی تو وہ روح تڑپ تڑپ کر بھٹکتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی بھوت پریت بن کر۔

پاکیزگی کا دامن تھام کر اگر تپسیا یا عبادت کر کے اپنے لبادے ترک کر کے اپنے آپ کو زندگی کے سفر سے دُور رکھ کر، خود کو دنیا بنانے والے کے سپرد کر لیے تو پارسائی کا انعام بطور موکش یعنی بار بار جنم لے کر مرنا اور مر کر پھر جنم لے کر، زندگی کے دشوار اور خوشگوار سفر سے آزادی۔

جبکہ برے لبادے میں روح کو قید کر کے عبرت ناک سزا۔ کیونکہ خودکشی ایک گناہ عظیم ہے۔

میں آسمان میں بھاپ کا لبادہ پہن کر اپنا میعادی سفر پورا کر چکا تھا اس لیے حیران تھا کہ میں موکش پا رہا ہوں یا بھوت بن کر بھٹک رہا ہوں۔

موسم بدلتے رہتے ہیں۔ ہاں مگر تاثیر اور کیفیت جانے کیوں بدل جاتی ہے۔ سوچ ایک ایک لمحے کے گزرنے کے ساتھ سمجھاتی رہی کہ میرے اوپر نیلا آکاش ہے جہاں تمھیں دیکھ کر تمھاری مدد کرنے والا یا تمھیں بھوت بنا گیا ہے۔

اچھا ہے جو تم دُھند، دھویں اور غبار کی بوجھ سے نہ مخلوق زمین کو دیکھ سکتے ہو اور نہ وہ تمھیں دیکھ سکتے ہیں۔ تمھیں رحمت کی علامت سمجھنے والے تمھیں زحمت کا بھیانک رُوپ سمجھ رہے ہیں۔ سمجھ ہمت کا حوالہ دے کر انتظار کرنے کے مشورے دیتی رہی اور یقین ڈرتی رہی کہ محبت کی خوشنودگی نفرت کی آلودگی پر حاوی ہو جائے گی۔

حالات سے واقعات اور واقعات سے حالات بدلتے رہے۔ اور میں انتظار کرتا رہا۔ مجھ سے کوئی میری بے قراری اور بے تابی جان کر کاش یہ جان پائے کہ زمین پر آ کر میں کتنا خوش ہوں کیونکہ میں جانتا تھا کہ سرد ہوا کی کوکھ میں جب میں نے برف کا لبادہ پہن لیا تھا تو مجھے معلوم تھا کہ

جب برف دھوپ میں سما جائے گی تب میں گلیشیروں کے دامن سے پانی کی لکیریں بن کر جنم لوں گا۔

پھر نوزائیدہ بچوں کی طرح خلقِ خدا کی دلچسپی کا مرکز بن جاؤں گا۔

گویا میری شناسائی، ویسے ہی ہوگی جیسے زرخیز زمین میں دہقان کا بویا ہوا بیج۔

بیج کو کوئی شیطانی پرندہ چونچ مار کر اپنے شکم میں ڈال دے، یہ خدشہ اتفاقاً دہقان کو بھی چوکس رہنے کے لیے اُس کی نیند اُڑا دے گا۔

بیج کے اندر میرا ہم نفس، ہم نوا لبادہ اُتار کر ایک پودے کے لبادے میں بود ہو جائے گا!

میں تب تک نونہال بچوں کی طرح رینگتے ہوئے دوسرے بچوں کے ساتھ چھوٹے نالوں کی شکل میں اپنی زندگی کا سفر شروع کردوں گا۔

پھر نوجوان عاشقوں کی طرح آبشاریں بن کر خود مستی کرتے ہوئے شادیانوں کی گونج سے شادمانی کی دستک دوں گا۔

پھر ایک ماں کی طرح، دریا، جھیل، چشمے، کنویں، تالاب اور نہروں سے جنگلوں، بوستانوں، گلستانوں، کھیتوں اور چراگاہوں کی آبیاری اور آبپاشی کر کے پانی کا لبادہ اُتار کر بھاپ کا لبادہ پہن کر تب ہواؤں کے سہارے آسمان کی طرف اُڑان لوں گا۔ جب گیلی مٹی، پھولوں، پھلوں اور خوشیوں کی مہک سے چہک کو لوٹ کر لاؤں گا۔

لیکن سوچا تھا کیا اور کیا ہو گیا—!

گویا ناخدا کا چپّو ایک منجمد دریا میں رُک گیا!

آسمان میں چھ ماہ کے عتاب دہ سفر کے بعد زمین پر ایک سال کے انتظار کے بعد وہیں کھڑا ہوں جہاں آسمان سے برف بن کر اُترا تھا۔

تب بھی چاروں طرف ڈراؤنی خاموشی چھائی ہوئی تھی—!

اب بھی نہ خاموشی کو توڑنے والا طوفان آیا ہے۔

نہ کوئی مسیحا آسمان پر نظر آرہا ہے اور نہ زمین پر کوئی برف کی سخت تہہ پر چل کر آنے والا کوئی اوتار یا فرشتہ—!

آخر کیوں؟ کوئی تو بتا دے؟

دنیا بنانے والا کیوں خاموش ہے؟

آخر کار خاموشی کو ایک طیارے کی آواز نے توڑ دیا ہے۔

اور اس طیارے میں بیٹھے چند لوگوں کی گفتگو سن کر دل رونا چاہتا تھا مگر منجمد دل آنسو بہا نہیں سکا۔

سوچ نے آخری بار سمجھایا کہ جب دنیا بنانے والے کو یا اپنے ذہین نیوکلائی قوت حاصل کرنے والوں نے یرغمال بنا دیا ہے تو زمین پر زندگی کے کارواں کو روک کر وہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا زہرہ پر زندگی ہے یا نہیں۔

دراصل وہ روح کو نیوکلیائی لبادہ پہنا کر اپنی مخلوق کو سارے عالم کے خاقان بن جانا چاہتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا بنانا چاہتے ہیں جہاں ہر جاندار خوشبو اور بدبو سے واقف نہ ہو۔ جبکہ ان کے اڈوں میں زندگی کے سفر کو طے کرنے کے لیے ہر رنگ و بو کی خوشی میسر ہو!

سمجھ مفلوج ہو چکی تھی اس لیے نہ خیالات کا تضاد اور نہ عمل میں کوئی رُکاوٹ! گویا کوئی اساطیری کہانی یا حکایت حقیقی رنگ میں سامنے آ گئی ہو۔

دنیا میں دنیا بنانے والے کی آنکھوں کے سامنے!

کوئی بتا دے کہ ایسا کیوں ہوا ہے؟

OO

شکوہ

جب ہر لمحہ آنے والے لمحے کا تعاقب کر رہا ہو تب ایک حسّاس انسان پر کیسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے یہ میں آج جان پایا ہوں۔ کاش اس کیفیت کو اپنے کیمرے میں قید کر سکتا

دراصل نوری کے قہقہے سن کر میں یوں چونک پڑا ہوں گویا میرے پاؤں تلے ٹھوس زمین اچانک دلدل بن گئی ہو! بات ہی ایسی ہے! طارق نے اس گاؤں کے بارے میں بلکہ گاؤں والوں کے بارے میں بھی جو کہا تھا وہ سچ ہے مگر جو اُس نے نوری کے بارے میں خود دیکھے، خود سنے بلکہ خود پر گزرے واقعات اور لمحات کے حوالوں سے مجھے رات بھر ایک کہانی سنائی تھی وہ ایک افسانہ بن کر سامنے کیوں آ رہا ہے؟ کہیں وہ اپنے ہی تصورات کے عکس تو نہیں مجھے دکھا چکا تھا؟ اگر ایسا ہے تو کیا جنت کا تصور بھی ایک افسانہ ہے؟

طارق نے نوری کے حسن کے بارے میں جو کہا تھا نوری اُس سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ یقیناً وہ کیچڑ میں کھلا ایک شاداب کمل کا پھول ہے۔ اس لیے میں نے اس کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا اور طارق کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی بجائے درمیان میں فاصلہ رکھ کر میں وصل کی اُس گھڑی کا انتظار کرتا رہا جس گھڑی کا میں سحر سے اب تک کرتا رہا ہوں۔ مگر اب حیران ہوں کہ راہی منزل کے سامنے ہار کر کیوں بیٹھا ہے! حیران ہوں کہ دونوں ایک دوسرے کو تقریباً بارہ سال بعد پہچان تو گئے تھے مگر دونوں کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ کم کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ طارق نے بتایا تھا کہ نوری اپنی چلبلی عادتوں کی وجہ سے غم اور خوشی کا اظہار یوں کرتی ہے جیسے ایک اُچھلتا مچلتا جل ترنگ بجاتا جھرنے کا پانی سامنے آ رہے پتھروں سے ٹکرا کر پوچھ رہا ہو کہ تم غم دو یا خوشی میں تم سے لپٹنے آیا ہوں!

نوری اُس وقت ایک جفاکش پہاڑی عورت کی طرح اپنے کچے مکان کی ایک بوسیدہ دیوار پر مٹی اور گوبر کا لیپ لگا رہی تھی اور دبی دبی آواز میں رُک رُک کر ایک رنجیدہ لوک گیت گنگنا رہی

تھی۔

کوئی صحن میں داخل ہوا ہے، پر وہ جان نہیں پائی تھی۔ شاید وہ اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ طارق نے جب اپنی موجودگی کا اشارہ دیا تھا تب نوری نے پلٹ کر یہ احساس تو دلایا تھا کہ وہ ایک شناسا چہرے کو دیکھ رہی تھی مگر وہ نظریں جھکا کر، جب اپنے ہاتھ صاف کر بیٹھی تھی تب وہ دَبے دَبے لہجے میں ''السلام علیکم'' کہہ کر طارق کے قریب آنے کی بجائے ایک بت کی طرح کھڑی رہی تھی! اس سے پہلے کہ طارق آگے بڑھ کر کچھ کہہ پاتا نوری کچھ کہے بغیر کمرے کے اندر چلی گئی تھی۔ یہ جاننے کے لیے طارق نے آواز تو نہیں دی تھی مگر وہ کیوں چلی گئی تھی یہ طارق کی سراسیمگی کی کیفیت عیاں کر رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ مجھ پر تجسّس اور تذبذب کی کیفیت طاری ہو گئی تھی اس لیے میں طارق کے قریب آ کر اُس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ روٹھ کر شکوہ کرنے کا ایک انداز ہے؟ اور اگر ہے تو طارق نوری کو منانے کے لیے آگے بڑھ کر کیوں نہیں روٹھے یار کو منا لیتا ہے؟

طارق ایک بہت ہی سنجیدہ اور بہت کم بولنے والا اس علاقے کی سڑکوں کے محکمے کا ایگزیکٹیو انجینئر تو ہے مگر وہ نجی زندگی میں ایک بہت ہی پیارا انسان ہے۔ ضدی ہے مگر خودسر نہیں ہے، لوہے کی طرح سخت ہے مگر پیار و محبت کی ہلکی سی آنچ سے بھی موم کی طرح پگھل جاتا ہے اور جذبات کی رَو میں بہہ کر جب اپنی سرکاری حیثیت بھول جاتا ہے تب خوب باتیں کرتا ہے۔

طارق سے میں پہلی بار کل صبح اُس پار واقع ہِل اسٹیشن کے ڈاک بنگلے میں ملا تھا۔ وہ تب اپنے ملازموں کو اس گاؤں کے بارے میں چند ہدایات دے رہا تھا۔ جب میں اپنے بائینو کیولر کی مدد سے اس گاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ صبح کی کرنوں میں برفیلے پہاڑوں اور سر بہ فلک جنگلات کے دامن میں سر سبز چراگاہوں و چھوٹے چھوٹے بالا دریوں کی مانند پہاڑی کھیتوں کے درمیان و چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے مکان دیکھ کر میرا دل مچل رہا تھا۔ میں ان مناظر کو کیمرے میں قید کر کے اپنے بدیشی ٹی وی چینل کے لیے ایک دستاویزی فلم بنانے کے لیے طارق صاحب کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ میں یہ جان گیا تھا کہ وہ وہیں جا رہے تھے۔ مجھے اس کے ایک ملازم نے یہ بتایا تھا کہ طارق صاحب ایک سخت مزاج افسر ہیں مگر جب ایک مختصر سی ملاقات کے دوران ایک اجنبی نے مجھے اپنائیت کا احساس دلا کر مجھے اپنے ساتھ بطور ایک مہمان ساتھ لینے

کی پیشکش کی تھی تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا یہ سفر اس قدر تعجب خیز ثابت ہوگا۔

پہلی بار میں تب چونک پڑا تھا جب میں نے یہ جانا تھا کہ ہم نے ایک گہری کھائی پار کر کے اُس گاؤں میں جانا ہوگا جو مجھے دوربین کی آنکھ سے بہت ہی قریب نظر آیا تھا۔

دوسری بار میں تب چونک پڑا تھا جب ہم پکی سڑک سے اُتر کر اس کچے، ناہموار، پتھریلے اور دشوار راستے پر پیدل چل پڑے تھے، حالانکہ ہم سب سرپنچ کے پیش کردہ گھوڑوں پر کم از کم ان سخت ڈھلکیوں کو پار کر سکتے تھے جو روز پیدل آنے جانے والے گاؤں کے لوگوں کے پھیپھڑوں پر اذیت کا دباؤ ڈالتی رہتی ہیں۔ مگر طارق نے ان کو واپس کر دیا تھا۔ اس لیے میں اس علاقے میں پہلی بار آیا ہوں جبکہ طارق دوسری بار آیا ہے۔

یوں تو پہاڑی علاقوں کی نرم دھوپ میں سردی کا سہانا احساس ہوتا ہے مگر پکی سڑک سے گاؤں تک کا سفر میرے لیے ویسا ہی اذیت ناک سفر تھا جیسا تپتی ہوئی ریت پر جھلسا دینے والی گرمی میں دھنس دھنس کر پیدل چلنے والا عبرت ناک سفر! ہمارے ساتھ آئے ہوئے لوگ بہت آگے نکل چکے تھے اور ہم دونوں بار بار رُک کر تھوڑا آرام کرنے کے بعد ہی پھر چل پڑتے تھے اور یوں باتیں کرتے کرتے سفر طے کرتے رہے۔ میں حیران تھا کہ اس کٹھن سفر کے بارے میں پوری جانکاری ہوتے ہوئے بھی طارق اُس کام کے لیے خود کیوں آیا تھا جس کام کو اس کا ایک جونیئر انجینئر بھی کر سکتا تھا! میری حیرت بھی تو مجھے چونکاتی رہتی تھی! خاص طور پر اس لیے کہ یہ سڑکیں ڈوربین سے بدصورت یعنی حقیقی شکل میں کیوں نظر نہیں آتیں؟ نظر آ جاتیں تو لوگ اس جنت کی حقیقت جان پاتے! ہم لوگ گاؤں کے نئے پنچایت گھر میں تب داخل ہوئے تھے جب سورج اُفق میں شفق کی لالی چھوڑ کر پہاڑوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔ گاؤں کو بوقت شام دیکھ کر میں یہ جان گیا تھا کہ چلو جہنم کے راستے سے سہی، ہم جنت میں تو داخل ہو چکے ہیں!

طارق کے چہرے پر اُبھرتی ہوئی شوخی مجھے یہ یقین دلا رہی تھی کہ وہ بھی وہی سوچ رہا ہوگا جو میں سوچ رہا تھا۔ یعنی یہاں پہنچنا ایک مسرت آمیز لمحہ تھا۔ یوں تو تھکاوٹ کی وجہ سے اگر ہم کھلے آسمان کے نیچے پتھروں پر بھی لیٹ جاتے تو ہم گہری نیند سو جاتے مگر میرے لیے یہ بھی چونکا دینے والی بات تھی کہ گئی رات تک طارق بھی میری طرح کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہونے کی وجہ اس علاقے میں دہشت گردوں کی موجودگی نہیں تھی بلکہ یہ کہ میں برفیلے پہاڑوں سے

جھانک رہی سحر کی کرنوں کو کیمرے میں قید کر کے اپنی فلم کی شروعات کرنے کا خواہش مند ہونے کی وجہ سے یہ چاہتا تھا کہ رات کو ایک سیاہ ورق کی طرح اُلٹ کر ایک کورے ورق پر جنّت کے نقوش درج کر سکوں! مگر طارق کی بے قراری کی وجہ کچھ اور تھی۔ وہ اس خوبصورت گاؤں میں سڑک کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہاں رہنے والوں کی بدصورتِ زندگی کو نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ ذہنی طور پر محسوس بھی کر چکا تھا۔ طارق اس گاؤں میں بارہ سال بعد آیا ہے۔

اِس بار وہ اپنی مرضی سے آیا ہے مگر اُس بار وہ اپنی مرضی کے خلاف آیا تھا مجبوراً، کیونکہ اُس کو تب بحیثیت ایک اسسٹنٹ انجینئر بطور سزا یہاں بھیجا گیا تھا مگر یہاں رہ کر ایک بد دماغ مغرور من مانی کرنے والا شخص حالات کی وجہ سے سنگِ خشت سے موم بن گیا تھا۔

طارق کی کہانی بھی چونکا دینے والی ہے۔

طارق کا باپ ایک بہت ہی امیر اور رسوخ والا سیاست داں ہے۔ طارق ملک کے امیر ترین لوگوں کے بچوں کے ساتھ بورڈنگ اسکولوں اور بہترین انجینئرنگ کالج میں پڑھائی مکمل کر کے جب اپنے گھر لوٹا تھا تب اپنے ساتھیوں کی طرح وہ ایک جونیئر انجینئر کی بجائے براہِ راست اسسٹنٹ انجینئر بن گیا تھا اور نوکری کے پہلے ہی دن سے ایک ذہین انجینئر کو اپنے افسروں نے یہ احساس بھی دلایا تھا کہ وہ ایک عام شخص نہیں بلکہ ایک اہم شخصیت ہے۔ یعنی جو وہ فطرتاً نہیں تھا وہ اس کے اِرد گرد رہنے والے مطلب پرستوں نے اس کو عملاً بنا دیا تھا۔ مطلب ایک عیاش شخص جس کا چہرہ ہی ہر سرکاری کام کی مشکلیں اور رکاوٹیں یوں دُور کیا کرتا تھا جیسے روشنی کی کرن اندھیروں کو مٹا دیتی ہے۔

چند مطلب پرست امیرزادوں کی صحبت میں ایک فرض شناس نوجوان انجینئر اپنے باپ کے رسوخ کی وجہ سے ایک دستہ سفارشی کارڈ بن گیا تھا جس کو سامنے رکھ کر لوگ فتوحات کا اعلان کرتے کرتے خود رسوخ والے بن گئے تھے اور وہ بھاری رقوم لے کر لوگوں کے ایسے کام بھی کرتے رہتے تھے جو ایک کا سر بچانے کے لیے سیکڑوں کے سر قلم کروا دیتے تھے۔ طارق کی خوشنودگی حاصل کر کے اس کے اعلیٰ افسران بھی اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہے تھے یعنی طارق ایک چھوٹا افسر ہوتے ہوئے بھی بے خوف تھا۔ اپنا کام کاج کرنے کی بجائے وہ کافی ہاؤس کلب یا کسی ہل اسٹیشن پر اپنے چاپلوس دوستوں کے ساتھ عیش اُڑاتا رہتا تھا۔ پھر اچانک سب کچھ بدل گیا تھا۔

سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے طارق کے والد کمزور پڑ گئے تھے یعنی طارق وہ اللہ دین نہیں رہا تھا جس کے پاس ایک جادوئی چراغ تھا۔ ایک شخص جو مہینے میں ایک بار بھی اپنے دفتر نہیں جایا کرتا تھا وہ ایک دن دفتر میں غیر حاضر ہونے کی وجہ سے انتقامی کارروائی کا شکار بن گیا تھا! طارق کی پوسٹنگ اسی گاؤں میں ہوئی تھی اور اُن لوگوں نے، جو اس کی وجہ سے کسی نہ کسی طریقے سے متاثر ہوکر اپنے ہی خون کے گھونٹ پی چکے تھے، اُس پر ہونے والی رعایتوں کے تمام دروازے بند کردیے تھے اس لیے طارق کو یہاں آنا ہی پڑا تھا۔ گویا اس کو ایک غار میں دھکیل کر غار کا منہ بند کر کے انتقام لینے والے چلے گئے تھے۔ مگر اس غار میں اس کو ایک جن مل گیا تھا جو اس کو وہاں سے نکال سکتا تھا! گاؤں میں آ کر اس کو زندگی کی پہلی اذیت ناک رات ایک سابق فوجی قادر گوجر کے گھر گزارنی پڑی تھی کیونکہ وہی اس کا سامان اٹھا کر اس کا ہم سفر بھی تھا اور راستہ دکھانے والا بھی تھا۔ اس رات طارق نے جب بھی اپنے درد کو ہلکا محسوس کیا تھا وہ تب ہوا تھا جب قادر کی پوتی نوری اپنی ہلکی پھلکی باتوں سے اس کو خوب ہنسایا کرتی تھی۔ لطیفے سنا کر نہیں بلکہ اپنی خستہ حال زندگی کو ایک مزاحیہ انداز میں بیان کر کے۔ نوری تب مشکل سے ۱۶ سال کی تھی جبکہ طارق ۲۴ سال کا تھا۔

نوری بے حد خوبصورت تھی مگر اس کو خود اپنی خوبیوں کے بارے میں جانکاری نہیں تھی۔ مگر اس کو اپنی خامیوں کے بارے میں بھی کسی قسم کا احساسِ کمتری نہیں تھا۔ اس کی پھٹی قمیض سے اگر اُس کا مرمریں بدن نظر آنے لگتا تھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس کر یہ کہہ کر طارق کو بھی ہنسا دیتی تھی کہ کھڑکیاں ہوا سے کھل گئی ہیں۔ بند کردوں یا کہو تو ہوا کو ہی قید کرنے کی کوشش کروں اپنے پھٹے دو پٹے سے، مگر ہوا اِن دروازوں سے بھاگ جائے گی۔

اسی رات قادر نے طارق کو غصے اور تلخی کے ملے جلے تاثرات سے یہ بتایا تھا کہ سرکار کوئی بھی ہو، سرپنچ کبھی سڑک نہیں بننے دے گا حالانکہ ہر سال سڑک بنانے کی مانگ کرنے والا بھی وہی ہوتا ہے۔ بقول اُس کے، سرپنچ ۲ سروں والا سانپ تھا۔ قادر نے طارق کو یہ بھی بتایا تھا کہ گاؤں میں کئی دفاتر ہیں مگر نام کے، کاغذوں پر یعنی سرپنچ کے چند کچے مکانوں کے مقفل دروازوں پر دفتروں کے بورڈ لگے ہیں اور اُن میں سبھی تعینات ملازم سرپنچ کو اپنی تنخواہ کا چوتھائی حصہ ہر ماہ دے کر گاؤں میں اپنے موجودگی اور تسلی بخش کام کرنے کی، اُسی سے تصدیق کروا لیتے ہیں اور یہاں آنے بھی نہیں دیتے۔ دور سے پر آئے افسران کو فقط سات کلومیٹر کا تکلیف دہ سفر یوں بتایا جاتا ہے جیسے ایک ٹوٹی

کشتی میں سات سمندروں کو پار کرنا ہو اس لیے وہ گاؤں کو دور سے دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ وہی تاثرات لے کر جو سرپنچ ان کو بتاتا رہتا ہے۔

گاؤں والے گھی، دال، مرچیاں، جنگل سے اکٹھی کی گئیں جڑی بوٹیاں، انڈے، ہاتھ سے بانٹے ہوئے اونی کمبل اور جلانے کی لکڑیاں سرپنچ کی دکان پر دے کر کھانے پینے کی چیزیں لے آتے ہیں۔ سرپنچ دکان پر جمع کر کے تمام چیزیں اپنے درجنوں گھوڑوں پر پکی سڑک تک لے جاتا جہاں اس کی ٹرکیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ قادر نے جو باتیں ظلم وستم کے حوالوں سے اور سرپنچ کی ان شاعرانہ کارستانیوں کے حوالے سے اپنے بیٹے اور بہو کے عبرت ناک انجام کی ایک المناک داستان اس لیے طارق کو سنا دی تھی تاکہ اس کی سمجھ میں بات آجائے کہ سرپنچ سے ذاتی دشمنی کی وجہ سے ہی وہ دوسرے تیسرے دن لکڑیاں لے کر پکی سڑک تک لے جاتا ہے اور ٹرک ڈرائیوروں سے کھانے کی چیزیں لے آتا ہے۔ مگر طارق کو داستان سن کر دو ہی باتیں یاد رہی تھیں۔ ایک نوری کا پری چہرہ اور اس کا اندازِ بیان اور دوسری یہ کہ غار سے نکلنے کا راز! دوسرے دن وہ فوری طور پر سرپنچ سے ملا تھا اور یہ طے ہوا تھا کہ طارق چند دنوں کے لیے گاؤں میں رہ کر، گاؤں کو ہمدردی کا یقین دلا کر، اپنے گھر چلا جائے گا اور لوٹ کر نہیں آئے گا۔ طارق اپنے آپ کو ملازم کی بجائے ایک سیاح سمجھ کر گاؤں میں کئی دن گھومتا پھرتا رہا اور اتفاقاً نوری اس کو روز اور بار بار مل جایا کرتی تھی اور اس کو خوب ہنسایا کرتی تھی۔ گاؤں کی خوبصورتی سے زیادہ اس کو نوری کی باتوں نے متاثر کیا تھا۔ وہی تو ایک ایسی لڑکی تھی جو سنجیدہ باتیں بھی ہنسی مذاق میں کرتے کرتے خود بھی ہنس پڑتی تھی اور طارق کو بھی قہقہے لگانے کے لیے مجبور کرتی تھی مگر جانے کیوں اس کی ایک ایک بات طارق کے دل میں کیل ٹھوک کر اس کو تڑپا دیا کرتی تھی!

گاؤں میں ایک نمونہ تھا۔ سکندر! سکندر کو نوری مذاقاً بطخ کہا کرتی تھی۔ وہ اس لیے کہ اپنی ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں کی وجہ سے بطخ کی طرح چلتا تھا۔ وہ اکیلا تھا حالانکہ کچھ لوگ جانتے تھے کہ وہ سرپنچ کی ناجائز اولاد ہے جس کی ماں کو ریچھ اٹھا کر لے گیا تھا اور بچے کو اس کی بوڑھی نانی نے پالا پوسا تھا۔ لوگ اس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے جبکہ سرپنچ اس کو دیکھتے ہی لال ہو جایا کرتا تھا۔ بطخ کو طارق سے متعارف کراتے وقت نوری نے اس سے کہا تھا حاکم! بطخ کو اپنا چپراسی بنالو! ترقی کر کے کسی دن سرپنچ بن جائے گا۔ کہیں جانا ہو تو آپ کا سامان اُٹھالے گا! ہاں مگر اس کے چلنے کی

رفتار اتنی تیز ہے کہ آپ کو واپسی پر مل جائے گا۔ یہ شادی کرنا چاہتا ہے؟ درخت بیچ کر اس نے جو ۲۵ روپے کمائے ہیں آپ کو دے دے گا۔ اگر آپ شہر سے اس کے لیے ایک بیوی خرید کر لے آئیں۔ ہاں تب دے گا۔ کیا کریں گاؤں میں اس کے قابل کوئی لڑکی نہیں ہے۔ نہیں تو درجن بھر بطخ پیدا کیے ہوتے۔ ہاں اگر بطخ لڑکی ہوتی تو میں اپنے دادا سے اس کا نکاح پڑھا دیتی! ایک تو میری دادی انڈے دیتی اور پھر کھانا بھی پکاتی، ہے نا؟ کیا کریں بطخ لڑکی بھی تو نہیں ہے نا! مرد ہے! عمر تین چار سو سال تو ہو گئی نمونے کی۔ عمر بڑھ گئی تو شادی شتر مرغ کے ساتھ کرنی پڑے گی۔ اور وہ بھی اس سے جس نے سرمہ لگایا ہو۔ بطخ کو سرمے دار آنکھیں بہت پسند ہیں۔

نوری کی باتوں پر یقین کر کے تب بطخ تار کول کی طرح طارق کے ساتھ چپک گیا تھا۔ پھر گاؤں میں گھوم پھر کر جس دن طارق گھر لوٹ جانے سے پہلے قادر سے ملنے آیا تھا وہ لکڑیاں کندھے پر اٹھا کر گاؤں سے بہت پہلے نکل گیا تھا۔ نوری اوکھلی میں لال مرچیاں کوٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے قابو آنسو نکل رہے تھے مگر چہرے پر خوشی کے تاثرات تھے۔ طارق نے جب اس کو اپنے سفر کے بارے میں اشارہ دیا تھا تو وہ ایک گیند کی طرح اُچھل پڑی تھی اور پھر اپنے آنسو پونچھ کر پہلی بار درد بھری آواز میں بول پڑی تھی۔ گویا آپ بھی۔ گویا سڑک نہیں بن پائے گی۔ گویا میرے دادا کو ایسے ہی!!

طارق نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی سرپنچ کے دونوں گھوڑوں کو واپس کر کے نوری کو یہ بتایا تھا کہ اب اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے اور وہ اپنا کام پورا کرنے کے بعد ہی اس گاؤں کو چھوڑ کر جائے گا۔ یہ سن کر گویا ایک سوکھی ٹہنی پر کونپلیں نکل آئی تھیں۔ نوری اس بار ہنستے ہنستے یوں رو پڑی تھی گویا اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔ تب وہ پہلی اور آخری بار خوشی سے اُچھل کر طارق سے لپٹ گئی تھی۔

طارق کے بلند عزم نے سرپنچ کی اَنا کو للکارا تو تھا مگر قدم قدم پر روکاوٹیں پیدا کرنے کے بعد بھی وہ ایک ذہین انجینئر کے ارادوں کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ سرپنچ اس قدر گر گیا تھا کہ اس نے ان دو جونیئر انجینئروں کو ڈرا دھمکا کر گاؤں میں گھسنے سے پہلے ہی واپس کر دیا تھا جن کو طارق نے مدد کے لیے شہر سے منگوائے تھے۔

طارق نے جب قادر سے اپنے شہر والے دفتر سے سروے کرنے کے لیے آلہ جات و دیگر

سامان منگوا کر خود سڑک کی سروے شروع کرنا چاہی تو سرپنچ نے نہ صرف ضرورت مند گاؤں کے نوجوانوں کو کام کرنے سے روکا تھا بلکہ دہشت گردوں کے قہر کی آڑ میں طارق کو بھگانے کی کوشش بھی کی تھی۔ ان دنوں چونکہ پنچایت گھر سرپنچ کے ہی بہت بڑے مکان کے چند کمروں میں ہوا کرتا تھا اس لیے سرپنچ نے طارق کو وہاں سے نکال دیا تھا اس لیے طارق کو مجبوراً قادر گوجر کے گھر میں ہی رہنا پڑا تھا۔

کام چلانے کے لیے طارق کو ایک ایسا لڑکا تنویر ملا تھا جس کو سرپنچ نے گاؤں کے بہت سارے لڑکوں کی طرح شہر میں افسروں کے گھروں میں گھریلو کام کاج یا کھانا بنانے کے لیے بھیجا تھا مگر وہ اپنے مہربان مالک کی وجہ سے اسکول میں داخل ہو کر دسویں جماعت تک پڑھائی کر چکا تھا۔ اس کے اور قادر کے علاوہ سکندر بھی طارق کے ساتھ کام کرتا تھا۔ نوری سب کے لیے کھانا بنایا کرتی تھی اور کبھی کبھی سڑک کی نشان دہی کے پتھروں پر چونے سے سفیدی کیا کرتی تھی۔ شام کو سب قادر گوجر کے گھر میں بیٹھ کر گئی رات تک قادر گوجر سے دلچسپ منظوم کہانیاں سنا کرتے تھے۔ کبھی کبھی نوری اپنی ہنسی روک کر لوک گیت بھی سنایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی طارق بھی کوئی فلمی گیت گایا کرتا تھا جو نوری رَٹ کر اکثر گنگنایا کرتی تھی۔ جوں توں طارق سروے کا کام پورا کر چکا تھا مگر اپنے اس قیام کے دوران وہ اپنی ضد پوری کرنے کی خاطر ایک بار بھی شہر نہیں گیا تھا حالانکہ وہ اکثر کھانستا رہتا تھا اور ہلکے بخار کی گرفت میں بھی مبتلا رہتا تھا۔ وہ یہ عہد کر چکا تھا کہ وہ تعمیر کا کام شروع ہونے کے بعد ہی پکی سڑک پر جائے گا، اس سے قبل نہیں۔ مگر حالات کا بہادری سے سامنا کرنے والا معقول علاج نہ ہونے کی وجہ سے بیماری کا مقابلہ نہ کر سکا تھا اور پھر ایک روز سرپنچ ہی اس کو بے ہوشی کی حالت میں شہر لے گیا تھا۔ فکر مند باپ اس کو دہلی لے گیا تھا اور وہ تقریباً ایک سال تک زیرِ علاج رہا تھا۔

اس دوران دہشت گردی کی کارکردگیاں جنگل کی آگ کی طرح وادی کے اِرد گرد کے علاقوں میں بھی پھیل گئی تھیں اور طارق چاہتے ہوئے بھی نہ گاؤں میں آ سکا تھا اور نہ سڑک کی تعمیر کے بارے میں کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے سے پوچھ تاچھ کر سکا تھا۔ یہ فقط طارق کا المیہ نہیں تھا۔ وادی میں گھسے دہشت گردوں نے پل اُڑا کر پچاس سال میں بنی سڑکوں کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ویسے ہی الگ کر دیا تھا جیسے اُن مکانوں کے مکیں جن کی دیواریں ایک دوسرے سے

ملتی تھیں کبھی، بچھڑ گئے تھے۔ ان حالات میں ایک نئی سڑک کا بن جانا ناممکن تو نہیں مشکل ضرور تھا۔ مگر طارق ان بارہ برسوں میں نہ تو اس گاؤں کو بھول گیا تھا اور نہ قادر گوجر کو دیا وہ وعدہ بھول گیا تھا کہ وہ صبح ضرور آئے گی جب وہ اپنے گھر کے باہر گھی، لال مرچیں یا ایندھن کی لکڑیاں ٹرک والوں کو بیچے گا۔ اس نے نوری کو بھی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کے دادا کی سانسیں سڑک بن جانے کے بعد کبھی نہیں پھول جائیں گی۔ طارق پچھلے ہفتے ترقی پر اُسی ڈویژن میں تعینات ہوا ہے، جس کے حدود میں یہ گاؤں واقع ہے۔ طارق یہ دیکھ کر حیران ہوا ہے کہ سڑک سالِ رواں کے منصوبے میں ہوتے ہوئے بھی شروع نہیں ہو پائی ہے۔ کیونکہ وہ سرپنچ کے ارادوں کو سمجھتا ہے اس لیے وہ یہاں سڑک کا کام شروع کرنے کے لیے خود آیا ہے۔

طارق رات بھر بولتا رہا، بولتا رہا اور میں نہایت دلچسپی سے سنتا رہا۔ ہم لوگ شاید صبح ہونے کے بعد بھی باتیں کرتے رہتے اگر ایک اسکول ماسٹر ہمیں چونکا نہ دیتا۔ طارق تنویر کو نام لے کر اپنے گلے سے لگا کر اپنی خوشی کا والہانہ اظہار کرتا رہا۔ پھر جب تنویر مجھ سے باتیں کرتے اچانک طارق سے مخاطب ہو کر دبے دبے لہجے میں پنچایت گھر کی پکی تین منزلہ عمارت کی دیواروں پر لگے مختلف دفتروں کے علاوہ اپنے اسکول کا بورڈ دکھا کر آہ بھر کر بولا تو میں پھر چونک پڑا، حاکم جی گاؤں ویسا ہی ہے جیسا تب تھا۔ مگر لوگ ویسے نہیں ہیں جیسے تب تھے۔ پہلے بدحال تھے، اب بدترین حال ہیں۔ یہ سارے دفتر ویسے ہی ہیں جیسے تب تھے۔ یعنی دواخانہ سرپنچ چلاتا ہے۔ ہاں میں گاؤں میں آنے والا اور رہنے والا واحد ملازم ہوں۔ مگر یہاں کا باشندہ ہوتے ہوئے بھی میں ایک بچے کو بھی پڑھا نہیں سکتا ہوں! یہ عمارت سرپنچ کی ذاتی ملکیت ہے۔ اور اب تمام دفتروں کی چابیاں اس کے بھائی نثار کے پاس ہی رہتی ہیں۔ نثار ہی انسانوں کا ڈاکٹر ہے اور وہی حیوانوں کا علاج کرتا ہے۔ نثار ہی گاؤں کا چوکیدار بھی ہے اور پنچایت کی دیکھ ریکھ بھی وہی کرتا ہے۔

تنویر کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر گاؤں والے پنچایت کے احاطے میں جمع ہو کر اپنے تذبذب اور تجسس کا اظہار پھٹی پھٹی آنکھوں سے طارق کو دیکھ کر کر رہے تھے۔ میں سحر کی کرنوں کو کیمرے میں قید نہیں کر پایا ہوں مگر مجھے اس بات کا دُکھ نہیں ہے۔ دُکھ ہے تو اس خوبصورت گاؤں کے زرد چہرے دیکھنے کا۔ سوچ رہا ہوں کہ گاؤں کی بجائے گاؤں کے لوگوں پر فلم بنا دوں اور دنیا کو دکھا دوں! طارق بہت آگے نکل کر ایک گھر میں گھس گیا تو میں سمجھ گیا تھا یہ نوری کا گھر ہوگا۔ تنویر نے تصدیق

کی تھی۔ اس لیے میں نوری کو دیکھتا رہا۔ لیکن وہ بھی حیران تھا کہ نوری مکان کے اندر کیوں گھس گئی۔ اس سے پہلے کہ میں گاؤں والوں کی چہ می گوئیاں سنتا نوری ایک چھوٹا سا ٹرانجسٹر لے کر باہر آئی اور زنگ آلودہ سیل ہاتھ میں رکھ کر بہت ہی دھیمی آواز میں بولی۔ آہیں بھر بھر کے۔ آپ کا ریڈیو یہاں رہ گیا تھا۔ آپ نے جو کہا تھا میں نے ویسا ہی کیا تھا۔ میں نے بیڑی نکال کر رکھ دی تھی۔ آپ نے سکھایا تھا نا حاکم! دادا زندہ ہوتے تو آپ کا سواگت کرتے۔ دادا انتظار کرتے رہے کہ کب سڑک بنے اور وہ لکڑیاں لے کر اپنے گھر کے باہر ٹرک کا انتظار کریں۔ وہ گھڑی آئی ہی نہیں۔

وصل کی یہ گھڑی جو بارہ سال بعد آئی تھی ایسی ہوگی یہ میں نے کبھی سوچا نہ تھا اس لیے میں ایک بار پھر چونک پڑا۔ نوری اپنے دادا کے حوالے سے کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ شاید۔ مگر اس کے تھرتھراتے ہونٹ بے آواز تھے۔

یہ دیکھ کر طارق بے ساختہ رو پڑا اور ۲۸ سال کی نوری ایک ۸۲ سال کی بوڑھی عورت کی طرح اپنے سینے سے اس کا سر رکھ کر اس کو تسلیاں دیتی رہی۔ مگر پھر چونک پڑی۔ اس دوران تنویر نے مجھے نوری کی دُکھوں بھری داستان سنائی تو میں بھی اپنے آنسو روک نہیں پایا۔ ہوا یوں تھا کہ سرپنچ نے قادر گوجر سے انتقام لینے اور گاؤں کو عبرت کا خونخوار چہرہ دکھانے کے لیے دہشت گردوں کو پناہ دے کر چند فوری اقدام کیے تھے جن میں سب سے زیادہ عبرت ناک سانحہ قادر کا قتل اور نوری کی بے حرمتی کا قصہ تھا۔ نوری شاخ سے جدا ہوئے پتّے کی طرح طوفان کی گرفت میں آ گئی تھی اور سرپنچ نے ہی اس کی زبردستی شادی کرادی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھ کر دونوں کو تسلیاں دیتا نوری اچانک چونک کر، پیچھے ہٹ کر، نظریں جھکا کر اور ہاتھ جوڑ کر طارق سے مخاطب ہو کر درد بھرے لہجے میں بولی۔ دادا تو کب کا آزاد ہو گیا ہے حاکم! جانے ہم کب تک قید میں رہیں گے حاکم!

سکندر نے نوری کے پیچھے پیچھے ایک بطخ کی طرح چلتے چلتے آستین سے اپنی ناک بار بار صاف کرتے کرتے جب طارق کے سامنے رُک کر اس سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی تب طارق جھک کر سکندر سے ہاتھ ملانے کی بجائے یوں چونک پڑا گویا اس پر بجلی گر پڑی تھی۔ اِرد گرد لوگوں نے جب سکندر کو ایک مینڈک کی طرح اُچھلتے ہوئے دیکھا تب شاید ہی کوئی ایسا تھا جو اپنی ہنسی

روک پایا تھا۔ نوری آہیں بھر کر لوگوں کے چہرے دیکھتی رہی۔ پھر وہ پہلے مسکرا کر سکندر کی ناک صاف کرتے کرتے ہنس پڑی مگر آنکھوں میں آنسو کے سیلاب کو روک کر اور پھر قہقہے لگاتے ہوئے اسی چلبلے انداز میں بولی جیسے طارق نے مجھے رات بھر بار بار بتایا تھا۔ ہنسنے والوں کو دیکھ کر میں بھی ہنس پڑی ہوں حاکم! آپ بھی ہنس پڑو حاکم! بات ہی ایسی ہے۔ ہے نا؟ اب سن بھی لو حاکم! نہ شکوہ نہ شکایت اور نہ اپنائیت کا دعویٰ! بس ایک عرض ہے، سن لو تو عنایت ہوگی۔ دادا کی اُمیدیں حسرتوں کے منوں مٹی کے تودوں کے نیچے دادا کے ساتھ ہی لحد میں سوگئی ہیں۔ سونے دو۔ جگادو گے تو! دادا کی بات رہنے دو میرے اس بلبلے پر ترس کھا کر اس بار سڑک بنوادو۔ یہ پکی سڑک تک جانہیں سکتا۔ مجھے جانا پڑتا ہے۔ دادا کے ہوتے ہوئے ان کی نگہبانی مجھے نظر بد سے بچایا کرتی تھی۔ اب جب لکڑیاں لے کر پکی سڑک پر جاتی ہوں تو، تو ڈرائیوروں کی نظریں بے باک ہو جاتی ہیں۔ بے شرمی کی باتیں کرتے ہیں۔ زیادہ رقم دینے کی پیشکش کرتے ہیں۔ اگر میں قریب نہیں آنے دیتی ہوں تو وہ آدھی قیمت دے کر مجھے گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ سڑک گاؤں تک آئے گی تو میں اپنے شوہر کو ساتھ لے جایا کروں گی۔ لکڑیاں تو میں ہی کاٹ کر لایا کروں گی حاکم! مگر بیچتے وقت میرا شوہر میری حفاظت کرے گا نا؟ کرے گا۔ کرے گا۔ ضرور کرے گا۔ یہ میرا پیارا بلبلہ!

نوری یہ کہہ کر طارق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی بجائے سکندر کی ناک صاف کرتے ہوئے قہقہے لگا رہی ہے۔ طارق کبھی نوری کو اور کبھی سکندر کو دیکھ رہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے وہ جم کر برف کا مجسمہ بن گیا ہے، اور نوری کب سے قہقہے لگا رہی ہے۔ مگر اس بار نوری کے قہقہوں میں درد بھری چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ کیا یہ چیخیں حالِ دل سنا رہی ہیں یا پھر شکوہ کر رہی ہیں۔ مگر کس سے؟

OO

کاش

آج زندگی میں پہلی بار سلیم نے اپنے سسر خواجہ جلال الدین کو مغلِ اعظم جلال الدین اکبر کی طرح محبت کرنے والوں کا دشمن پایا تھا۔ مغلِ اعظم کو اپنے جانشین شہزادہ سلیم کا ایک معمولی رقاصہ انارکلی کو ہندوستان کی ملکہ بنانا منظور نہیں تھا جبکہ ایک لکڑہارے کے بیٹے کو دیکھتے ہی دیکھتے سرحد سے جڑے گنجان جنگلات کے بے تاج بادشاہ کو آج سیاسی اختلاف کی وجہ سے اپنی قابلیت اور ذہانت کے بل بوتے پر حکومت ہند کے افسر اعلیٰ کو ایک رقاص کا بیٹا کہہ کر اپنی بیٹی کو اپنے داماد سے الگ کروانے کے لیے بضد تھا۔ بات ایک ہی تو تھی۔ انارکلی ایک رقاصہ تھی اور تب اُس سے پیار کرنے والا ایک شہزادہ جبکہ آج جلال الدین کی بیٹی شہزادی ہے اور سلیم ایک رقاص جو کبھی جلال الدین کی نجی اور عیاشی کی محفلوں میں اکثر فرمائش پر ٹھمکے بھی لگایا کرتا تھا۔

سلیم کو اپنے سسر کی طاقت سے زیادہ اس کی حکمتِ عملی کے بارے میں معلومات تھیں۔ مغلِ اعظم تلوار اٹھا کر خود میدانِ جنگ میں کود کر دشمن کو ہرا کر فتوحات کے جشن منایا کرتا تھا جبکہ آج کا جلال الدین ایک بساط بچھا کر، مہروں کے شہید ہونے یا غدار کہلوانے یا القاب دے کر اپنی متوازی حکومت چلا کر، اپنی حکمتِ عملی کو تحریک کا نام دے کر، دنیا بھر میں اپنی شناخت قائم کرتا رہتا ہے اور ہر شطرنج کے کھیل میں گھوڑے کے چونکا دینے والے ڈھائی قدم کی طرح اپنی پری چہرہ یا جنت کی حور بیٹی کے درد اور کرب کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کر کے، خود ہاری ہوئی بازی کو، اپنے حریف کی جیت میں بدلنے نہیں دیتا۔ جبھی تو اس کے حریف اس کو ایک سلجھا ہوا سیاست داں اور رقیب اس کو لومڑی کی طرح مکّار لیڈر سمجھتے ہیں۔

سلیم اور شہزادی کے لیے وہ ایک ایسا چھاتا ہے جو ان کو قہرِ خدا سے تو نہیں مگر قہرِ آدم سے بچانے کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتا تھا مگر آج جو بھی ہوا اور جو بھی سڑک پر ہو رہا ہے وہ جلال الدین کی بلند آواز نے تماشائیوں کو اس قدر اُکسا دیا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہوتا اگر شہزادی صورتِ حال بدلنے میں کامیاب نہ ہوئی ہوتی۔

سلیم اور شہزادی کی محبت کوئی الف لیلوی عشقیہ کہانی نہیں ہے۔ ماں باپ کے سائے سے محروم ایک دسویں جماعت کا لڑکا امتحان میں بیٹھنے کے لیے خواجہ صاحب سے فارم کے ساتھ فیس بھرنے کی خاطر رات بھرنا چاہتا تھا، گایا تھا مگر خواجہ جلال الدین نے اس کو بھی گاؤں کے لڑکوں کی طرح اپنی فوج یا شطرنج کے مہروں میں شامل کرلیا تھا۔ لڑکے اپنے کتابوں کے تھیلوں میں سرحد پار سے آئے ہوئے لوگوں سے نقلی واصلی کرنسی لایا کرتے تھے اور گشت کرنے والی ملیٹری کی نگہبان آنکھوں میں دُھول جھونک کر سلیم سے بھی یہی کام کروایا جاتا تھا مگر وہ باقی لڑکوں کی طرح تسلی بخش کام کر نہیں پاتا تھا۔ سلیم چونکہ ڈرپوک تھا اس لیے اس سے گھر کا کام کرایا جاتا تھا۔

دراصل سلیم نے اپنے آپ کو ڈرپوک ظاہر کیا تھا کیونکہ وہ بے حد ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی عمر اس کی جسمانی عمر سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ خواجہ صاحب کی لطیفہ گوئی کا مفہوم سمجھ گیا تھا اور ہمیشہ فرار ہو جانے کے طریقوں کی تلاش میں رہا کرتا تھا۔

ایک بے بس لڑکا کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس لیے جب بھی وقت ملتا تھا وہ خواجہ صاحب کی بیٹی کی بکھری پڑی کتابوں کو سمیٹ کر ان کی ورق گردانی کیا کرتا تھا۔ تو یوں قسمت نے ساتھ دیا اور سلیم کو شہزادی کے قریب آنے کا موقع مل گیا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ شہزادی اسکول جایا نہیں کرتی تھی البتہ ایک بزرگ اس کو گھر پر پڑھایا کرتے تھے۔ شہزادی ریاضی کا سوال حل نہیں کر پا رہی تھی اور وہ جانتی تھی کہ اس کا استاد اس کو سوال حل کرنے کے لیے کہے۔ چونکہ وہ آگے دوڑ پیچھے چھوڑ کے رویے سے تنگ آ چکی تھی اس لیے اس نے سوال کو حل کرنے کی ضد پکڑلی تھی اس لیے وہ بار بار کوشش کرتے کرتے رو پڑی تھی۔ سلیم نے اس کی کیفیت بھانپ کر جب سوال کو حل کر کے اس کے سامنے رکھا تو شہزادی نے غیر دانستہ طور پر سلیم کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

اس وقت شہزادی کی عمر سولہ سال تھی اور سلیم اٹھارہ سال کا تھا اور دسویں جماعت کے امتحان میں بیٹھنے کے لیے داخلے کی فیس کے لیے یوں تڑپ رہا تھا گویا ماہیٔ بے آب۔ ہمت کر کے اس نے جب اپنے دل کی بات شہزادی کو بتائی تو اس نے ترس کھا کر اس کو فیس کی رقم دی تھی۔ نتیجہ آنے پر جب جلال الدین کو پتہ چلا کہ سلیم ضلع میں پہلی پوزیشن لے چکا ہے تو اس نے اپنی لاڈلی بیٹی کی سفارش پر سلیم کو شہر بھیج دیا یہ سوچ کر کہ ذہین لڑکا اس کی تنظیم میں پڑھ لکھ کر کوئی بہتر کام کر سکتا ہے۔ لیکن تب تک وہ یہ جان نہیں پایا کہ اس کی بیٹی بارھویں جماعت میں یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن

لینے والے ایک تفریح کرنے والے رقاص سے پیار کرنے لگی تھی۔ پھر اس خیال سے کہ اس کو ایک ذہین جانشین مل گیا ہے تو اس نے پیار کے جذبات کو نکاح پڑھوا کر شادی کے بندھن میں باندھ لیا۔ دونوں کا رشتہ جنسی لذت کی بجائے ایک دوسرے کو سمجھنے کے مقصد کے دائرے کے باہر نہیں آیا جبھی تو بیوی نے شوہر کو اپنی منزل کی طرف جانے سے روکا نہیں تھا بلکہ ہم نفس، ہم نوا اور ہم سفر ہونے کا احساس دلایا تھا۔ یعنی سلیم کی ہر بات سنجیدگی اور غور سے سنتی رہتی تھی اور کبھی کبھار جب سلیم اپنی آرزوؤں کا ذکر اپنے مخصوص انداز سے کیا کرتا تھا تو شہزادی سنی ہوئی باتیں طوطے کی طرح بولتی ہوئی اپنے ملائم ہاتھ سلیم کے ہونٹ پر رکھ کر ایک لفظ 'کاش' سن کر ان تمام جملوں کو ترنم میں سنایا کرتی تھی اور ساتھ ساتھ آواز کے ساتھ کسی ساز کی بجائے ہنستی رہتی تھی گویا سلیم کی کہی نظم کے ساتھ جل ترنگ بجا کر ایک سکون بخش فضا پیدا کر دیتی تھی مثلاً جونہی نہایت سنجیدہ لہجے میں 'کاش' لفظ سلیم کے منہ سے نکلتا شہزادی جملوں کو پورا کرتے ہوئے سنا دیتی۔

— کاش خدا نے زمین پر بھی سورج، چاند، ستاروں کی روشنی کی طرح سرحدوں کی لکیریں نہ ڈالی ہوتیں! اور سحر کی اُجلی کرنیں دہشت کے انگاروں کو بجھا دیتیں! کاش خدا نے دنیا کے اِرد گرد ہوا کے ایک ہی دائرے کی طرح غذا کے ذخیرے بھی رکھ دیے ہوتے! تا کہ ہر انسان ناک سے ہوا اور منہ سے غذا کھا لیتا! نہ کوئی محتاج ہوتا اور نہ کوئی داتا ہوتا۔ کاش خدا نے ہر انسان کے دماغ میں خوشبو سونگھنے کی حس رکھی ہوتی تا کہ بارود کی بدبو کو چار سو پھیلنے سے پہلے پھیلانے والے مر جاتے —!

سلیم کو شہزادی کے قہقہوں میں دنیا میں امن و امان کی جھلکیاں اُبھر کر سامنے نظر آیا کرتی تھیں اور یوں اس کی چھٹیاں کٹ جایا کرتی تھیں۔

جلال الدین سلیم کی انجینئرنگ کی تربیت کے دوران جب بھی انجان پڑھے لکھے لوگوں کو اپنی تنظیم، جس کا بقول ان کے سلیم ان کا پڑھا لکھا جانشین تھا، کے بارے میں تازہ ترین حالات سے پیدا ہوئے واقعات یا حکمتِ عملی سے تراشے ہوئے واقعات سے بنائے ہوئے حالات کے بارے میں تازہ ترین خفیہ جانکاری دینے کی کوششیں کرتا رہتا تھا مگر سلیم چھپا چھپی کے طرح طرح کے کھیل کھیل کر ان لوگوں سے دُور رہ کر ٹریننگ مکمل کرتے ہی دو سال کے لیے اپنے گاؤں سے دُور رہا۔

شہزادی کے صبر و تحمل اور اس کے چہرے پر اندیشوں، خدشات، غمِ جدائی کے تاثرات کو نہ

دیکھ کر جلال الدین کا شک یقین میں بدل گیا تھا کہ اس کا جانشین دغاباز نہیں ہے اور وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تنظیم کی بہبودی کے لیے شہزادی کو اپنے خفیہ مشن کے بارے میں بتا چکا تھا۔ اس لیے مطمئن تھا۔

پھر ایک روز اپنے ایک تنظیم ساتھی کی بدولت اور اس کے دکھائے گئے اخبار کے حوالے سے وہ جان گیا کہ سلیم نے آئی اے ایس کا امتحان پاس کرلیا ہے۔ اس سے پہلے کہ اپنے داماد کو، ایک رقاص کے بیٹے کو دغاباز سمجھتا اس کے ساتھی نے اس کو سمجھایا کہ سلیم کا سرکار میں ایک اعلیٰ عہدے پر رہنا تنظیمی کارکردگیوں کو سہل بنانے میں مفید ثابت ہوسکتا ہے تب جلال الدین کی کیفیت فوراً کورٹ بدل کر سلیم کے حق میں جا کر مسرت کا احساس دلا دیتی ہے۔

پھر جب سلیم شہزادی کو دہلی بلانے کا پیغام بھیجتا ہے تب جلال الدین اپنی حکمتِ عملی کے تحت شہزادی کے ساتھ خود جانے کا منصوبہ عمل میں لاتا ہے اور سلیم کو ایک حسین ساتحفہ دینے کی خاطر جب سلیم کی کال بیل دباتا ہے تو دروازہ کھلتے ہی وہ سلیم کو جھٹکا دے کر اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں اس کاروان کے بارے میں کہہ دیتا ہے جو وہ سلیم اور شہزادی کے نئے گھر اور اپنی تنظیم کے خفیہ دفتر کو شکل دینے کے لیے اپنے ساتھ لائے دو ٹرکوں کے ساتھ دہلی پہنچ گیا ہوتا ہے۔ ٹرکوں کے ساتھ آئے چار عدد نوجوان جب ٹرکوں سے قالین، فرنیچر، چاول کی کئی بوریاں اور ایک رسوئیا کو اپنے ساتھ برتن وغیرہ سڑک پر دیکھ کر سلیم بوکھلا کر شہزادی کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتا ہے تب جلال الدین مزاحیہ انداز میں دُور کھڑی ایک نئی قیمتی کار میں بیٹھی شہزادی کو آنے کا اشارہ کر کے سلیم کو یہ اطلاع دیتا ہے کہ یہ ہمارے سفیر کی عالی شان کار ہے جس کو ہماری تنظیم کا ذہین ترین ممبر ڈرائیو کرے گا۔

سلیم شہزادی کو سڑک کے ایک طرف لے کر یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس کو ایک کمرے والا فلیٹ ملا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ وہ آئی ایف ایس درجے میں آ کر فارن منسٹر کے دفتر میں اٹیچ ہوا ہے۔ یہ سن کر جلال الدین بھڑک اٹھتا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ معاملے کو سیاسی رنگ دے پاتا پڑھے لکھے دانشور ڈرائیور نے جلال الدین کو بتایا کہ فارن سروس پاس کرنے والوں میں فقط میرٹ ہولڈرز کو ہی ملتا ہے اور ان کی ڈیوٹی فقط مختلف ممالک کے سفارت خانوں میں ہوا کرتی ہے۔ یہ جان کر جلال الدین کی باچھیں کھل گئیں۔ فقط اس لیے کہ سلیم جلال الدین کے تنظیمی نیٹ ورک میں ان کا کام کرتا رہے گا۔

سلیم اپنے سسر کے چہرے پر اُبھرتی ہوئی خوشی کے تاثرات دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا اور وہ

شہزادی سے گھبرا کر باتیں کرتا رہا۔

پھر سڑک پر ہورہا تماشہ ایک ہنگامے کی شکل اختیار کر گیا۔ آس پاس کے فلیٹوں میں رہنے والے چونک پڑے، تماشائی بن گئے۔ وجہ یہ کہ جب جلال الدین بآوازِ بلند یہ کہتا رہا کہ میری بیٹی ایک کمرے میں ایک عندلیب کی طرح شکاری کی قید میں نہیں رہ سکتی۔ دہلی والے شہزادی کو اپنی سرپرستی کے کھوکھلے دعوے کر کے اور اپنے پن کا ڈھونگ رچا کر اپنی تحویل میں نہیں رکھ سکتے۔ ایک نام نہاد اعلیٰ عہدہ دے کر اس کو ایک کمرے کا فلیٹ دے کر میرے داماد کو ایک غلام نہیں بنا سکتے! نہیں چاہیے ہمیں یہ دکھاوٹ کا عطیہ! یہ میری ہی آواز نہیں ہے بلکہ میرے لوگوں کی آواز ہے! میں آج اپنی بیٹی کے لیے ایک محل خریدنے جارہا ہوں۔

جلال الدین کا جملہ اس کے ساتھی افسروں کو بھی اُکسا رہا تھا اور سبھی سمجھ رہے تھے کہ ایک سیاست داں ایک شفیق باپ اور سسر کی آڑ میں کیا کہہ رہا تھا۔

اگر سلیم شہزادی کو یہ نہیں سمجھا دیتا کہ اس کو یہ کوارٹر اس لیے ملا ہے کیونکہ وہ منسٹر کے ساتھ کام کررہا ہے تو وہ بھی گمراہ ہوگئی ہوتی۔ اور اپنے باپ کے حکم پر وہ کار میں بیٹھ گئی ہوتی اور پہلی بار اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے اونچے رتبے کا احساس دلاتی۔ کچھ پیار و محبت کی خاطر اور کچھ ایک محسن ہونے کے ناطے۔

سامان پھر ٹرکوں میں رکھا گیا تو جلال الدین نے گویا یلغار کی آواز بلند کر کے سلیم اور شہزادی کو کار میں بیٹھ کر کاروان میں شامل ہونے کو کہا تو سلیم نے سختی سے انکار کردیا۔

جلال الدین نے سلیم کو ایک رقاص کے بیٹے کا طعنہ دے کر اپنی بیٹی سے کہا کہ وہ ایک خاندانی پیشہ ور رقاص سے مطلب کے لیے تفریح کرنے والے کو لات مار کر اس کے ساتھ چلی آئے مگر جب بیٹی نے ہی باپ کے حکم کو ٹھکرا دیا تو جلال الدین اپنے منصوبے کو ریت کی دیوار کی طرح بکھرتے ہوئے دیکھ کر اپنے ساتھ لائے ڈرائیور، نوکروں اور رسوئیا کے ساتھ نظریں نہیں ملا سکا کیونکہ وہ سبھی اس کے تنظیمی ساتھی تھے۔

شہزادی اپنے مجازی خدا کے ساتھ اس ایک کمرے والے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی سلیم سے لپٹ کر بول پڑی کہ وہ اس محل میں کبھی نہیں جائے گی جہاں ان کے گاؤں والے گھر کی طرح ہر کمرے کی دیواریں سازشوں کی شواہد ہیں۔

ٹرکوں کے جانے کے بعد جب میاں بیوی نے کار کے جانے کی آواز سُنی تو کھڑکی کھول کر

ڈور ڈور تک نظریں دوڑا کر یوں دیکھتے رہے جیسے وہ جغرافیائی حدود کو توڑ کر اور سرحدوں کو جوڑ کر، اُفق کو دیکھتے ہوں۔ مگر اس بار شہزادی بول پڑی:

کاش: ہمارے رشی منیوں اور انسانیت سے پیار کرنے والے مفکروں کی باتیں بھاپ بن کر، آسمان میں تیر رہے بادل کے ٹکڑوں کی طرح بارش یا برف بن کر زمین میں سلگ رہی آگ کو بجھا کر، زرخیز زمین سے پھولوں کے پودوں کی آبیاری کرتے تا کہ ہمارے نوجوان بارود کی بدبو کی بجائے خوشبو سے اپنے مستقبل کی پذیرائی کرتے اور وہ سب امن کے شیدائی ہوتے۔

کاش — تیز دُھوپ کی شفق سے چارسو پھیلی سیاست کی دھند چھٹ جاتی اور سینکڑوں بہکے، بھٹکے اور بھڑکے نوجوان سرحدوں کے آر پار جا کر دو بلیوں کی طرح کسی بندر کو فائدہ پہنچانے کی بجائے اپنے اُن راستوں کی تلاش کر کے اپنی اپنی منزلوں تک پہنچ پاتے۔ سلیم کی طرح!

سلیم اس بار شہزادی کی باتیں سنتا رہا۔

کاش — دنیا والے بھی جلال الدین کی سیاسی باتیں سننے کی بجائے اس کی بیٹی کی باتیں سن لیتے جس کی فلاح و بہبودی کے لیے وہ برسوں سے شطرنج کے کھیل کھیلتا رہا ہے! سلیم دفتر میں فائلیں دیکھتے دیکھتے یہی سوچتا رہا۔

مگر یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ شہزادی کی باتیں کس کو کیسے بتائے؟ سیاست سے اس کو نفرت ہے مگر ایک سیاست داں کے ساتھ ہی تو وہ شطرنج کے مہرے ساتھ لے کر پہلی بار کسی دوسرے ملک کے ٹور پر جا رہا ہے! کاش وہ شہزادی کو اپنے ساتھ لے جا سکتا۔

OO

گردش!

اچانک سراسیمگی کی گہرائیوں میں ڈبکیاں لگا رہی رجنی شرما کو یہ احساس ہوا کہ اُس کی اُمید کی سحر ایک گیند کی طرح اچھل کر رات کے اندھیرے میں کھوگئی ہے! یعنی اُمید نے نہ دِن دیکھا اور نہ شام!

گویا زندگی کا سفر ایک بار پھر اُس کے اپنے طے شدہ راستے پر چلتے چلتے اس بار بھی ایک دوراہے پر رُک چکا ہے۔

ایسا اس کے ساتھ بار بار کیوں ہوتا رہتا ہے!؟

منزل کے قریب پہنچ کر بھی وہ اپنی من چاہی منزل سے کیوں دُور ہو جاتی ہے؟ کیا اُس کی تدبیروں میں ہر بار کوئی کمی رہ جاتی ہے یا اُن پر، اُس کے جنم سے وابستہ تاروں (گرہوں) کی گردش حاوی ہو جایا کرتی ہے!

اس بار اُس نے اپنے آپ کو اُس ہم سفر کے ساتھ منسلک کر دیا تھا جو اُس کے ایک مقررہ وقت پر ایک خاص جگہ پر مل کر اُس کا ہم سفر ہم نوا بن گیا ہے اور دونوں کی ایک ہی منزل ہے جو سامنے تو ہے مگر نظر نہیں آتی۔ کیا اُس کو اسی منزل کو اپنی من چاہی منزل سمجھ کر قبول کرنا چاہیے یا پھر وہ اپنے اعتماد کے بل بوتے پر اپنے ہم نفس ہم نوا کو تدبیر کی راہ پر چل کر اُس منزل کو پانے کی سعی کرے یعنی دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی من چاہی منزل کی تلاش کرے!

مگر تذبذب و تجسس کی شکار رجنی کے قدم گویا ایک دوراہے کے آگے تھم گئے ہیں —! وہ بے حد ذہین ہے اس لیے وہ جانتی ہے کہ ایک راستہ اُس کی من چاہی منزل تک جائے گا اور دوسرا اُس کو اپنی منزل سے، ہر قدم چل کر منزل سے دُور کرتا جائے گا —! یہ وہ تب سے جانتی ہے جب سے اُس نے ہوش سنبھالا ہے۔

وجہ یہ کہ وہ بہت ذہین ہے اور چھ سال کی عمر میں وہ ایک سولہ سال کی لڑکی کی طرح اپنی ماں اور اپنے باپ کی باتوں اور مشوروں پر سوچ کر اپنی رائے بنانے کی عادی ہو چکی ہے —!

ہاں اپنی رائے بنانے سے پہلے وہ اپنے والدین کے متضاد خیالات سے متاثر ہو کر اکثر ایک پینڈولم (Pendulum) کی طرح جھولتی رہتی ہے۔

آج بھی اُس پر ایسی ہی سیمابی کیفیت طاری ہو چکی ہے!

اور سمجھ نہیں پا رہی ہے کہ اجنبی ہم سفر کے ساتھ اعتماد اور عزم کے بھروسے اگلا قدم اٹھائے یا اعتقاد کے یقین پر وہاں چل پڑے جہاں اس کو اجنبی ہاتھ پکڑ کر لے چلے!

آج اُس کی شادی ہونے جا رہی ہے!

رجنی اپنے باپ کی لاچاری سے باخبر ہے اس لیے اُس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ شادی کی رسومات دھوم دھام سے ہوں — ! مگر وہ یہ تو چاہتی تھی کہ اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہو — باپ لگن منڈپ پر اُس کا کنیا دان کرے تب جب اُس کی ماں سہاگ راگ جس کے لیے وہ اپنے چھوٹے قصبے میں مشہور ہے، گاتی رہے — اور والدین اُس کو وداع کریں — !

دل کی باتیں دل میں ہی رہ گئیں اور وہ جانتی ہے کہ ماں کو اُس کی مجبوری سن کر دُکھ ہوگا مگر بیٹی کی شادی ہو گئی یہ جان کر وہ مسرّت کا بھی اظہار کرے گی۔ یہ سمجھ کر کہ شادی شدہ لڑکی کو نرک (جہنم) میں نہیں بھیجا جا سکتا ہے جبکہ اچھے کرموں (کارکردگیوں) کے باوجود ایک کنواری کو نرک میں ہی مرنے کے بعد جگہ ملتی ہے!

پہاڑوں کی گود میں، ایک پہاڑی دریا کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک پراچین مندر ہے جہاں دیواروں پر کریدی ہوئی جنت اور جہنم کی تصویریں ہیں — مندر میں موجود قدیم زمانے کے ہاتھ سے لکھی کتابیں ہیں — اُن میں ہاتھوں سے بنی تصویریں ہیں جن کے تعلق سے دُور دُور سے لوگ اپنی تقدیر کے بارے میں جانکاری حاصل کرتے رہتے ہیں۔

روز شام کو مندر کے احاطے میں کتھائیں سنائی جاتی ہیں اور دن بھر لوگ کتابوں کے حوالوں سے اپنی مشکلوں کا حل تلاش کرنے آتے جاتے ہیں۔ مندر کے پجاریوں کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ نہ صرف ہاتھوں کی لکیریں پڑھنے بلکہ جنم پتری بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ اور اہم بات یہ کہ مندر کے پجاری صدیوں سے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے بارے میں یہ سخت ہدایات ہیں کہ پجاری دکھشنا میں وہی لیتے ہیں جو یاتری اپنی مرضی سے دے دے!!

ظاہر ہے کہ پجاریوں کی اقتصادی حالت کسمپرسی میں ہی قید رہتی ہے۔ رجنی کا باپ تب ایک انقلابی اسکول ماسٹر تھا جب اُس کا باپ مر گیا۔ مجبوراً بے چارے کو نوکری چھوڑ کر مندر کا پجاری بننا

پڑا تھا۔

اُس کی ماں چونکہ بچپن میں ہی مر گئی تھی اس لیے اُس کی بیوی مندر کی صفائی سے لے کر دیواروں پر بنی تصویروں کو رنگ کر پھیکا ہونے نہیں دیتی ہے۔ بلکہ وہ کبھی کبھار غریب لوگوں کی بستیوں میں جا کر کتھائیں سناتی رہتی ہے وہ ان عورتوں کی زچگی کے بارے میں اُن کی مسیحا ہے۔

یعنی وہ جو وقت پر مفت اسپتالوں کے دروازوں تک بھی نہیں پہنچ پاتے ہیں اُن کے بچوں کو وہ کوکھ کے اندھیروں سے نکال کر سورج، چاند، ستاروں کی روشنی دکھا دیتی ہے!

بدلے میں وہ کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیتی ہے وہ اس لیے کہ وہ اس جنم میں کارِ نیکی کر کے اُس کی جزا اگلے جنم میں لینا چاہتی ہے—!

وہ اپنی اس جنم کی مشکلوں کو اپنے پچھلے جنم یا جنموں کے کارِ بد کی سزا سمجھ کر، وہ جو ہوتا ہے، جو ہو چکا ہے یا جو آنے والے کل ہوگا، کو مقدر سمجھ کر خوشی خوشی قبول کر لیتی ہے۔

جبکہ یاتریوں میں اپنے ہنر کے لیے ہر دل عزیز رجنی کا باپ، تقدیر کی وکالت کرنے والا اپنے بارے میں فقط تدبیر کو اہمیت دیتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے قول اور عمل میں لیل و نہار کا فرق ہونے کی وجہ سے میاں بیوی میں تکرار بلکہ جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ جن کا اثر ان کی اِکلوتی اولاد کی سوچ و سمجھ پر حاوی ہوتا رہا ہے۔

رجنی کے باپ نے اپنی بیٹی کی جنم پتری بھی نہیں بنائی ہے اور کبھی اس کے ہاتھوں کی لکیریں نہیں پڑھی ہیں کیونکہ وہ اپنی بیٹی کو ہمیشہ یہ بتاتا آیا ہے کہ امریکہ کے ایک صدر ابراہم لنکن کے ہاتھوں میں جنم لیتے وقت ہاتھوں میں کوئی لکیر نہیں تھی—! گویا ہاتھ ایک بیاباں کے مانند تھے۔ مگر اُس نے اپنے آہنی ارادوں، بلند عزم اور اعتماد سے اُس کو کھیتوں میں بدل دیا تھا۔ اس جنم میں کیے گئے اچھے کرموں اور کارد گیوں کا اچھا پھل، اسی جنم میں پا لیا تھا—!

باپ خوش ہے کہ اُس کی اِکلوتی اولاد مندر کی اگلی پجارن نہیں بن سکتی! جبکہ ماں اس کی وجہ بھی پچھلے جنم کے بُرے کرموں کی سزا سمجھ کر بیٹی کو پاٹھ پوجا میں مصروف رکھ کر چھ سال کی عمر سے ہی مندر کی سرگرمیوں اور قدیم کتابوں کے مفہوم سے باخبر رکھتی آئی ہے کیونکہ اس کے اعتقاد کے مطابق اُس کا جنم یاتریوں کی خدمت کرنے لینے لیے ہوا ہے اور اُس کا بس چلتا تو وہ اُس کی شادی کروا چکی ہوتی!

ماں نے اس کو ساوتری کا نام دیا تھا مگر باپ نے اسکول میں اُس کا نام رجنی درج کرایا تھا۔

وہ اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ اُس کی بیٹی رجنی گندھا پھول کی طرح باغ میں زمین سے پانی چوس کر شاداب نظر آئے اور زمین سے الگ ہو کر وہ کسی قدر دان کے گلدان میں رکھے پانی کو چوس کر کھلتی رہے اور مہکتی رہے۔

دو سال پہلے رجنی نے اپنے باپ کے اصرار پر ملک گیر میڈیکل کالجوں کے داخلے کے امتحان میں امتیازی پوزیشن حاصل کر کے بھی بازی، ریزرویشن کوٹوں کی وجہ سے جب ہاری تھی تب ماں نے دو باتیں کہی تھیں ——

ایک یہ کہ اپنی قابلیت کا مظاہرہ اس لیے کر سکی کیونکہ اس پر علم کی دیوی سرسوتی ماں کی مہر ہے۔

دوسری یہ کہ کون کہاں، کس وقت اور کس کے گھر میں پیدا ہوتا ہے یہ پربھو ہی طے کرتا ہے۔

بچہ پیدا ہوتے وقت اُس وقت کے تاروں کے اثر میں خود اپنے ساتھ اپنی زندگی کے سفر کا طے شدہ سفرنامہ یا ازل نامہ لے آتا ہے۔ غم اور خوشی، آہ اور واہ کے واقعات اسی میں درج ہوتے ہیں اور جو بھی ہوتا ہے جنم دینے والے کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اس لیے شوخیوں اور تلخیوں دونوں کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے۔

اُس نے بیٹی کو یہ احساس دلایا تھا کہ اگر ڈاکٹر بن جانا اُس کے نصیب میں ہوتا تو وہ ایک غریب پجاری کے گھر میں پیدا ہی نہیں ہوئی ہوتی بلکہ کسی کوٹے والے گھر میں پیدا ہوئی ہوتی یا کسی ایسے گھر میں جنم لے چکی ہوتی جہاں اس کو ڈاکٹری کی سیٹ خرید کر دی جا سکتی تھی —— ! دِل شکستہ! رجنی کو، تب ماں نے، یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ باپ کے بتائے ہوئے نہایت دشوار راستوں پر چلنے کی بجائے مندر کے احاطے میں غریب بچوں کو سرسوتی کا دان دے کر اپنا اگلا جنم خوشگوار بنانے کی کوشش کرے!

اس پر راجنی کا باپ بھڑک اُٹھا تھا اور یہ کہہ گیا تھا کہ وہ اپنی کوشش جاری رکھتے ہوئے ایک بار پھر تدبیر سے بگڑی تقدیر کو سنوارنے کی خاطر ایک نیا راستہ کھوج لے!

رجنی نے اپنے باپ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بی.ایس.سی کرنے کے بعد آئی.اے. ایس. کا امتحان پاس کر لیا ہے اور وہ اپنے چھوٹے قصبے سے بڑے شہر انٹرویو کے لیے آئی تھی اور دس دن بعد وہ آج اس وقت عدالت کے احاطے میں اپنی شادی رجسٹر کروانے کی خاطر اپنی باری کا انتظار کر رہی ہے۔

اس کے اِردگرد درجنوں جوڑے بھی اپنی باری کا بے صبری سے انتظار کرتے ہوئے جج

صاحب کے دروازے پر اُبھر چکے نمبر کو دیکھ کر پھول رہی سانسوں پر قابو پانے کی خاطر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر مسکرا رہے ہیں، جبکہ ٹوکن نمبر کے قریب آتے دیکھ کر رجنی اپنے ہونے والے شوہر سے بار بار اپنی دو شرطوں کے بارے میں کرید کرید کر جواب طلب کرنا چاہتی ہے مگر دیپک ہر بار اس کو اِدھر اُدھر کی باتیں یا لطیفے سنا کر ٹال دیتا ہے ــــ!

رجنی جواب طلب کرنے کی خاطر اپنی محسن ہیڈ نرس مسز شانتی سے بات کرنا چاہتی ہے مگر وہ ڈاکٹر عالمگیر اور ڈاکٹر کرانتی کے ساتھ یہ کہہ کر گئی ہے کہ تینوں گواہ، جن کی موجودگی میں شادی رجسٹر ہوگی، نرسنگ ہوم سے فون پر اطلاع ملتے ہی دس منٹ پہلے عدالت کے احاطے میں حاظر ہو جائیں گے اس لیے رجنی تذبذب کی لہروں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان کی آمد کا انتظار کر رہی ہے!

رجنی کو اس بات کا احساس ہے کہ اگر بم حادثے کے بعد دیپک نے اس کو گود میں اُٹھا کر بڑے شہر کے سب سے بڑے نرسنگ ہوم میں داخل نہ کرا دیا ہوتا اور وقت پر اپنا فون نہ دیا ہوتا تو آج اس وقت اس کے والدین، اس کے آبائی قصبے میں اُس کا دسویں دن کا شرادھ کروا رہے ہوتے ــــ!

شادی نظریں ملتے ہی چاہت کے جذبے کی وجہ سے نہیں طے ہو پائی ہے بلکہ حالات ہی ایسی کروٹ لے چکے ہیں کہ شادی کے بغیر کسی اور حل کے بارے میں سوچا ہی نہیں جا سکتا ہے!

پہل ملٹی کروڑ پتی کے بیٹے نے کی ہے اور رجنی نے مسز شانتی کے ذریعے اپنے والدین کے بارے میں دیپک سے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے!

ہوا یوں تھا کہ رجنی اپنا چھوٹا سا بیگ سینے سے لگا کر ریلوے اسٹیشن کے باہر یو پی ایس سی کے دفتر جانے کی خاطر ایک آٹو رکشا کا انتظار کر رہی تھی تب اُس کے کانوں میں ایک گرج نما آواز گونج کر اس کے حواس چھین گئی تھی۔ پھر کیا ہوا تھا وہ مسز شانتی نے رجنی کو اور دیپک نے ڈاکٹر کرانتی کو بتایا تھا۔

مسز شانتی نے جب دیپک کی گود میں ایک خون سے لت پت لڑکی دیکھی تھی تب یہ سوچا تھا کہ اپنے زخموں کی پروا کیے بغیر ایک بہت ہی مہنگے نرسنگ ہوم میں علاج کے لیے لانے والا، فوری طور پر کیے جانے والے آپریشن کے لیے ایک موٹی رقم کا چیک دینے والا بلکہ آپریشن کے دوران اپنا خون دینے والا رجنی کا کوئی رشتے دار ہوگا مگر تیسرے دن اپنے آپکو ایک عالیشان کمرے میں نرسنگ ہوم کی ملائم و شاداب مریضوں کی پوشاک میں پا کر وہ جان گئی تھی کہ کوئی اجنبی اس کو یہاں لے آیا تھا ــــ!

اخبار پر تاریخ دیکھ کر رجنی یہ جان گئی تھی کہ اس کے انٹرویو کی تاریخ نکل گئی ہے۔ وہ حادثے کا حوالے دے کر ایک بار متعلقہ افسران سے فوری طور پر رابطہ قائم کرنے کی خاطر مسز شانتی اور ڈاکٹر کرانتی سے مدد مانگ لی تھی تب وہ جان گئی تھی کہ اس کے کھو چکے بیگ کے بارے میں کسی کو جانکاری نہیں تھی!

گویا وہ گھڑی بھی یاد آ گئی تھی جب گھر سے نکلتے وقت ایک کالی بلّی نے اس کا راستہ کاٹ لیا تھا! ماں نے گھر میں داخل ہو کر، پوجا کرنے کے بعد، پرشاد کھا کر جانے کی ضد پکڑ لی تھی مگر باپ نے ایسے اقدام کو ترقی پسند سوچ میں رکاوٹیں ڈالنے والے ڈھکوسلے بتا کر یہ کہا تھا کہ مشرق میں اُلّو کو منحوسیت کی علامت سمجھا جاتا ہے جبکہ مغرب میں وہ خوش بدبختی کا پیغام دینے والا پرندہ ہے!

یوں اب رجنی اپنے آنسوؤں کو پی تو گئی تھی مگر ماں کی سوچ سمجھ پر یقین ہونے لگا تھا۔ مگر اچانک حالات کروٹ بدل کر اُس کو اپنے باپ کی باتوں میں اپنی اُمید کا عکس نظر آنے لگا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ آٹھویں دن جب اُس کی پٹیاں اُٹھ چکی تھیں اور وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی دیپک بیگ لے کر اُس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

اُس نے یہ بتایا تھا کہ اُس کی کار جس میں وہ رجنی کو نرسنگ ہوم لے آیا تھا اُس کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے اس لیے کار مرمت کے لیے گئی تھی ۔۔۔ اور اُسی دن آ چکی تھی۔ دراصل جب بم دھماکہ ہوا تھا رجنی دیپک کی کار کے سامنے گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ دیپک نے اس کو فقط انسانی رشتوں کی قدر کرتے ہوئے جب کار میں ڈالا تھا تب اس کے اکڑ چکے بازوؤں میں اس کا بیگ تھا جس کو ہٹا کر دیپک نے اس کا بہہ رہا خون روکنے کی خاطر اپنی قمیض کے دونوں بازو کاٹ کر، ابتدائی مرہم پٹی کی تھی۔

بیگ کار میں ہی رہ گیا تھا اور ورک شاپ والوں نے بیگ میں رجنی کی سندیں دیکھ کر دیپک کو بیگ کی طرف متوجہ کیا تھا۔

ایک بار پھر انسانی رشتوں کی قدر کرتے ہوئے وہ بیگ لے کر نرسنگ ہوم آیا تھا، تب رجنی جان گئی تھی کہ اُس کا مسیحا ایک کروڑ پتی والدین کا پچیس برس کا اکلوتا وارث ہے۔

ڈاکٹر کرانتی دیپک کی بے لوث خدمت سے متاثر ہوا تھا جبکہ دیپک رجنی کی تعلیمی قابلیت کے علاوہ اُس کی پُرکشش شخصیت سے متاثر ہوا تھا۔

وجہ یہ کہ پہلی بار اُس نے رجنی کو خون میں لت پت ہو کر دیکھا تھا۔ پھر اس کے بیگ میں

موجود اُس کے امتحان میں داخلے کے فارم پر چسپاں ایک تصویر دیکھ لی تھی اور اب نرسنگ ہوم کے شاداب پلنگ پر بیٹھی ایک نیلے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے مگر پرکشش جسم کی نمائش کرنے والے لباس میں دیکھ کر وہ چونک پڑا تھا۔ فوٹو میں اُس کے بال گویا فکسو (Ficso) سے چپکائے گئے تھے، وہی بال گھٹاؤں کی طرح اُس کے نورانی چہرے کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔

جب دیپک نے رجنی کو اپنائیت کا احساس دلایا تھا تب رجنی نے اشارتاً مدد مانگ لی تھی تاکہ وہ یو پی ایس سی کے افسران سے مل کر معقول حالات کا حوالہ دے کر اپنی اُمید کو پھر ضیا بخش سکے! مگر دیپک جاتے جاتے رجنی کو ایک ماڈل بن جانے کا مشورہ اشارتاً دے گیا تھا۔

کمرے سے نکلتے وقت، کمرے کے باہر جب ڈاکٹر کرانتی نے دیپک کو دیکھ لیا تھا تب اس نے ڈاکٹر عالمگیر، جو نرسنگ ہوم کی پیتھولوجی یعنی خون پیشاب وغیرہ کی جانچ کرنے کے شعبے کے سربراہ ہیں، کو دیپک کی بے لوث خدمات کے بارے میں قصیدے پڑھنے شروع کیے۔ جونہی خون دینے کے بارے میں ذکر ہوا تو ڈاکٹر عالمگیر چونک پڑا۔

اُس نے فوری طور پر رجنی کے خون کی جانچ کرانے کی مانگ کردی تھی!

جانچ ہوئی تو ڈاکٹر عالمگیر نے ڈاکٹر کرانتی کی مجبوری کی قدر کی کیونکہ بلڈ گروپ اے بی نگیٹو بلڈ بینک میں ہوتا نہیں اور بہت کم لوگوں میں پائے جانے والے اس گروپ کے خون خیرات کرنے والوں یا خون بیچنے والوں کو بلانے میں جتنا وقت لگ سکتا تھا اس دوران رجنی خون کی کمی کی وجہ سے مرگئی ہوتی! مگر اس بات سے دونوں بے حد افسردہ ہیں کہ دیپک ایچ آئی وی پازیٹو ہے اور وہ یہ مہلک لاعلاج بیماری غیر دانستہ طور پر رجنی کو دے گیا ہے۔

ڈاکٹر عالمگیر دیپک کو جانتا ہے!

دیپک ایک سونے کا چراغ ہے جو اپنی باتی سے تیل چوس کر جلتا رہتا ہے!

جب تیل ختم ہو جاتا ہے تب وہ ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔ اکثر جنسی لذت کی طلب اس پر ویسی ہی کیفیت ٹھونس دیتی ہے جیسی ایک ڈرگس عادی پر ڈرگس نہ ملنے کی وجہ سے طاری ہو جایا کرتی ہے۔ یوں تو بقول دیپک، وہ فنونِ لطیفہ کے شعبے میں دلچسپی لیا کرتا تھا لیکن چند لالچی دلالوں نے اس کو ہر فن مولا کا خطاب دے کر، اپنے خرچے پر، پانچ ستارہ ہوٹلوں میں محفلیں سجانے کی عادت ڈال دی تھی۔

وہ بھی بیرونی ممالک سے آئے ہوئے گلوکاروں اور مصوروں کی صحبت میں رہ کر وہ کبھی اعلیٰ

صداکار بن جایا کرتا تھا اور کبھی چتر کار، یوں وہ لاکھوں روپے خرچ کر چکا تھا۔ پھر دو سال پہلے ایک لالچی دلال نے اس کی ملاقات اٹلی سے آئی ایک ایسی پوشاکوں کی ماڈل سے کرادی تھی جو نیوڈ پینٹنگز (Nude Paintings) میں دلچسپی لیا کرتی تھی ــــ! جو قربتوں کا فائدہ اُٹھا کر اپنے آپ کو دیپک کی ماڈل اور دیپک کو اپنا ماڈل بنا کر اس کو جنسی لذت کا چسکا بھی لگا گئی تھی۔

دلال نے اُس کو جان بوجھ کر ایک دلدل میں ڈال کر بچاؤ کی ترکیبیں اپنے پاس رکھ لی تھیں!

پھر اچانک اس کو خون کی جانچ کرانی پڑی تھی اور اپنے انجام سے باخبر ہو کر تب کے ایک انتقامی جذبے کے تحت اس نے بیرونی ممالک کی حسیناؤں کو اپنے خرچے پر بلا کر ان کو بیماری بھی معاوضے کے ساتھ دینے کا ایک سلسلہ وار منصوبہ بنا ڈالا ہے۔

مگر بقول ڈاکٹر عالمگیر وہ اب انتقامی کی بجائے ایک انقلابی بن جانے کا خواہشمند ہے!

دونوں نے رجنی کے بہت زیادہ قریب رہنے والی مسز شانتی سے بات کی تو رجنی بھی اپنے انجام کے بارے میں جان گئی تھی!

حادثے کے بعد اس کو اپنی ماں کے عقیدوں میں سچائی نظر آیا کرتی تھی اس لیے وہ بے ساختہ روتے ہوئے مسز شانتی کو بتا گئی تھی کہ وہ کنواری ہو کر مرنا نہیں چاہتی ہے۔

رجنی کی معصومیت میں سچائی بھی تھی اور بالغیت بھی ــــ!

ایسا ڈاکٹر عالمگیر نے رجنی سے کہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایک لڑکی جو اپنی سوجھ بوجھ اور ذہانت سے انڈین فارین سروسز کے لیے منتخب ہو چکی ہے اپنی لاعلاج بیماری کا مقابلہ دلیر سے کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر عالمگیر کے مشورے پر اگلے دن جب دیپک شادی کی تجویز لے کر رجنی سے ملا تھا تب اُس نے اپنی ماں کے عقیدوں پر عمل کر کے شادی کو کاتبِ تقدیر کی ہونی سمجھ کر فوراً قبول کرلیا تھا مگر شادی کے لیے دو شرطیں رکھ لی تھیں اور آج وہ دیپک سے ان کے بارے میں تفصیلاً جواب چاہتی ہے مگر وہ اپنائیت کا احساس دلا کر چھوٹی سی زندگی میں وہ تمام خوشیاں دلانے کا یقین دلاتا رہتا ہے جو بقول رجنی، ان کے موروثی قدیم مندر کی دیواروں پر نمائش کے لیے جو بھی جنت کے تصور کے بارے میں عیاں کیا گیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ایڈز بیماری کے بارے میں جان کر اُس کی سوچ تقدیر اور تدبیر، اعتقاد اور اعتماد کے درمیان ایک پینڈولم کی طرح جھولتی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن اپنی شادی کے لیے رکھی دو

شرطوں کو وہ ایک ایسی بازی سمجھ رہی تھی جس کی مدد سے تدبیر ہی تقدیر پر حاوی ہو سکتی تھی۔اس نے شادی کرنے کی درخواست پر یہ سمجھ کر دستخط کر لیا تھا کہ شادی ایک ماہ کے بعد ہونی ہے اس لیے تب تک حالات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بدلا جا سکتا ہے، لیکن ایک دن بعد ہی تاریخ ملنا یا تو دیپک کے رسوخ کا میوہ ہے یا پھر دونوں کی اچھی کارکردگی کی جزا اسی جنم میں مل گئی ہے۔

شک کا کیل جو قلب میں اُتر کر دماغ کو منتشر کر دیتا، اپنی ماں کی باتیں یاد آتے ہی نکل گیا۔

ماں کہا کرتی تھی ہے کہ اس جنم میں پوجا پاٹھ یا اچھے کام کرنے کے عوض کڑی دھوپ میں سفر کرتے وقت سر پر ایک چھاتا یا اوڑھنے کے لیے چادر مل جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ رجنی کا اپنے آپ کو دیپک کے حوالے کر دینے کا ارادہ ٹھوس تھا۔

اچانک اس کے خیالات کا تسلسل دیپک کی آواز سن کر ٹوٹ گیا اور وہ چونک پڑی! دیپک ڈاکٹر کرانتی کو فون پر یہ اطلاع دے چکا ہے کہ آدھے گھنٹے تک ان کی باری آنے کی توقع ہے۔

دیپک نے کسی کو فون پر یہ اطلاع دی ہے کہ وہ ایک گھنٹے تک اپنی بیوی کے ساتھ سہاگ رات کی بجائے سہاگ دن منانے کے لیے آرہا ہے۔

رجنی جانتی ہے کہ وہ زمین سے کٹ کر رجنی گندھا پھول کی طرح دیپک کے گلدان سے پانی چوس کر مرجھانے سے پہلے کھلی کھلی نظر آئے گی اور آخری سانس تک مہکتی رہے گی — مگر شک کے کیل نے پھر کرید شروع کر دی تو اُس نے فیصلہ کن لہجے میں دیپک سے اپنی دونوں شرطوں کے بارے میں جواب مانگا۔

دیپک نہایت میٹھی زبان میں بول پڑا!

"رجنی اب ہم ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہونے جا رہے ہیں اس لیے یہ شرط کہ ہم بچے کو جنم نہیں لینے دیں گے ایک بے شکل شرط ہے!"

ایک بیابان میں ایک پرندہ ایک بیج چھوڑ آتا ہے اور وہ ایک درخت بن جاتا ہے جبکہ زرخیز زمین میں بوئے بیج کو پرندے اپنے شکم میں ڈال دیتے اور کاشتکار فصل کا انتظار کرتا رہتا ہے۔

ہم کیسے جان پائیں گے کہ کون کب اور کیوں ہمارے گھر میں جنم لے گا۔

جو پیدا ہوگا اپنا مقدر لے کر پیدا ہوگا!

دوسری شرط بھی بے معنی سی لگتی ہے۔اوّل تو وہ دفتر ہماری شادی رجسٹر ہونے تک بند ہو چکا ہوگا، دوم یہ کہ ایک کروڑپتی کی بیوی سرکاری ملازمت کیوں کرنے لگی۔ بیماری لگ چکی ہے۔

دونوں کا سفر لمبا تو ہوگا نہیں — چھوٹی سی دُنیا میں میاں بیوی محبت کی انتہا نہ دیکھ لیں تو دونوں کو تشنگی کا احساس شدت سے تڑپاتا رہے گا — اُس کو زیادہ جو اپنے ہم نفس کو وداع کر کے تنہا رہ سکتی ہے!

دیپک کچھ اور کہہ کر اپنے ارادوں کو صحیح ٹھہراتا لیکن جونہی وہ عدالت کے احاطے میں ڈاکٹر عالمگیر، ڈاکٹر کرانتی اور مسز شانتی کو داخل ہوتے دیکھ لیتا ہے۔ وہ دوڑ کر اپنے گواہوں کا استقبال کرنے کے لیے چل پڑا ہے!

رجنی ایک دانشور ہے اور وہ سمجھ گئی ہے کہ دیپک ایک سونے کا چراغ ہے، ایک پانی بھرا گلدان نہیں ہے!

وہ رجنی گندھا پھول کو شاخ سے کاٹ کر تروتازہ رکھنے کی خاطر پھول کو آخری سانس تک پانی نہیں پلا دے گا بلکہ اس کی نمی کو چوس کر بدبودار بنا دے گا بلکہ اَدھ کھلے شگوفوں کو وہ جھلس دے گا۔

رجنی کا ماتھا ٹھنکا — سہاگ دن اگر حمل ٹھہر گیا تو کیا وہ بچہ گرا کر اپنے سنگین گناہ کے لیے جہنم میں جائے گی؟

بصورت دیگر کیا وہ اپنی اولاد کو بچپن میں ہی مر جانے کے لیے جنم دے گی؟

اس کے سامنے ایک دوراہا ہے۔

ایک پر باپ آوازیں دے رہا ہے! رجنی تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالو۔ اعتماد کے سہارے، بلند عزم سے، ایک نیا راستہ کھوج لو — تمھاری منزل یو پی ایس سی کا دفتر ہے۔

دوسرے پر ماں سمجھا رہی تھی — ایک اجنبی کی طرح ملا دیپک ستیہ وان ہے اور تم ساوتری! رُک جاؤ اور اس کو ملک الموت سے بچالو!

وہ جنم جنم سے تمھارا ہے! یا اس جنم میں تمھارے پچھلے جنم کا قرض اُتار رہا ہے یا تم پر اُدھار کا بوجھ لاد کر اگلے جنم میں وصول کرے گا۔

ذہنی انتشار کی وجہ دونوں کے جنم سے وابستہ گروہوں کی گردش ہے! یہ ایک آزمائش بھی ہو سکتی ہے!

آزمائش پر کھرے اتر گئے تو جزا بھی مل سکتی ہے!

تم دونوں اپنی بیماری کو ہرا بھی سکتے ہو!

رجنی دیپک کا اشارہ دیکھ کر دوڑتی ہوئی نظر آرہی ہے!

شادی کے تینوں گواہ اس کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں!

رجنی جج صاحب کے دروازے پر اُبھر چکا اپنا ٹوکن نمبر دیکھ کر، ٹوکن پھینک کر، دروازے کی طرف جانے کی بجائے ایک آٹو رکشا میں بیٹھ جاتی ہے۔

تینوں گواہ اس کو دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں جبکہ دیپک اپنی کار میں آٹو کا یوں پیچھا کر رہا ہے گویا ایک شیر ایک ہرنی کا تعاقب کر رہا ہو!

رجنی یونین پبلک سروس کمیشن کے دفتر کے سامنے کھڑی اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دیپک کو اپنی کار میں آگے جاتے ہوئے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتی ہے۔

ٹریفک جام کی وجہ سے کار اس کے سامنے رُک جاتی ہے اور یوں دیپک بھی اس کو دیکھ کر مسکرا رہا ہے کیونکہ اُس کی کار میں ایک بے حد خوبصورت لڑکی ہے! تب اس کو اپنے باپ کی باتیں یاد آتی رہی ہیں۔

راستے میں کانٹے بچھائے گئے ہیں اور تم سے کہا جا رہا ہے کہ اعتقاد کی پٹی باندھ کر اوّل تو بینا ہو کر نابینا بن جاؤ اور گرہوں کی گردش اپنے حق میں کرنے کی خاطر کانٹوں پر ننگے پاؤں چلو! کیوں؟ آسمان پر نظر آ رہے تاروں اور سیاروں کو زمین پر رہنے والے کے مقدر سے جوڑ کر ان کی گردش کا نام دے کر تدبیروں کو بے ہودہ گردشوں کی آلودگی کا شکار مت بنالو؟

ہاں میرا قول عمل سے بہت دُور ہے۔

میں وہ سبزی خوردُ کاندار ہوں جو انڈے بیچتا ہے!!

OO

وجود

ایک عقیدے کے مطابق میں نے یہ جسم چھوڑ دیا ہے اور میری آتما کو ایک نیا جسم مل جائے گا اس لیے میں اپنے چھوڑے ہوئے شریر (جسم) کے بارے میں کیوں سوچوں؟ مگر اُسی عقیدے کے مطابق میں اپنے اس جنم میں کیے اچھے یا بُرے کرموں کے لیے نئے جسم میں ایک نئی زندگی گزاروں گا۔

معلوم نہیں انسان بن کر، ایک جانور بن کر، ایک پرندہ بن کر یا ایک کیڑا مکوڑا بن کر، زمین یا پانی میں رہنے والا ایک جاندار بن کر! — ؟

اپنے آپ سے ڈر رہا ہوں کیونکہ میں نے جو بھی کیا ہے بُرا ہی کیا ہے۔ کبھی اپنے آقا کے اشاروں پر خون خرابہ کرایا، کبھی فسادات کروائے، کبھی بم بلاسٹ کروائے، کبھی بستیوں کو راکھ کے ڈھیر میں بدل کر ننھے بچوں کو شعلوں کا کفن اوڑھا کر نوحہ خوانی کرنے والوں کے ساتھ انگاروں کے نیچے دفن کیا!

ہاں یہ سچ ہے کہ میرے آقا نے مجھے ایک آرام دِہ زندگی دی تھی اور گولی لگنے کے بعد مجھے بچانے کے لیے اس بڑے اسپتال میں داخل کروایا تھا۔ دس دن سے لاکھوں کے خرچے پر اسٹریچر پر رکھا گیا ہوں حالانکہ میرا دماغ گولی لگ جانے سے تقریباً مر چکا ہے مگر میرے گردے، دل اور آنکھیں ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹروں کی ٹیم کہہ چکی ہے کہ میں اگر زندہ بھی رہوں گا تو ایک ویجی ٹیبل یعنی سُدھ بدھ کھو کر دن رات ایک زندہ لاش بن کر زندگی کاٹ سکوں گا۔ ان حالات میں میرے آقا نے مجھے لاوارث کہہ کر اسپتال کے اخراجات دینے سے انکار کر دیا ہے جن کو ادا کرنے کی خاطر اسپتال میں ہر وقت موجود گُردوں وغیرہ کے تاجر آہیں بھر کر پہلے میرے گُردوں کا سودا طے کر گئے ہیں۔ اس کے بعد آنکھوں کا بھی سودا طے ہو چکا ہے!

پھر یہ بھی طے ہوا ہے کہ میرے ہڈیوں کے ڈھانچے کو کسی میڈیکل کالج کو دیا جائے۔ مگر میرے ایک دُور کے رشتے دار کو میری جسم کی تجارت کے بارے میں اخبارات کے ذریعے معلومات

حاصل ہوئیں تو اس نے میرے ڈھانچے کی قیمت وصول کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ جبکہ ایک بڑا تاجر اپنے ساتھ ڈالروں سے بھرا بیگ اسپتال والوں کے سامنے رکھ کر تمام طے شدہ تجارتی مسودے رد کر کے مجھے بچا لینے کا عزم اٹھا بیٹھا ہے اور مجھے بطور ایک وبجی ٹیبل رکھنے کے عہد کا بھی اظہار کر گیا ہے!

سودا طے ہوا تو اب میں یہ جسم چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتا ہوں۔ مگر حیران ہوں کہ وہ چھید والی کھوپڑی کا کیا کرے گا میرے وجود کا خریدار؟ — یا میرا آقا! — ؟؟

ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی نے میرے آقا کو اپنے موبائل پر بتایا کہ وہ میری کھوپڑی میں چھید کے ذریعے ایک شیطانی آلہ ڈال کر مجھے ایک روبوٹ بنا دیں گے! ایک ایسا روبوٹ جو کسی کو بھی مار سکتا ہے مگر کوئی اس کا وجود مٹا نہیں سکتا! ظاہر ہے کہ میں یعنی میری آتما تڑپتی رہے گی۔ اور میں عقیدے کے مطابق ایک جسم چھوڑے بغیر دوسرے جسم میں پناہ نہیں لے سکوں گا!

OO

فساد

دونوں ہی بین الاقوامی شہرت کے اداکار ہیں۔ کئی فلموں میں ایک ساتھ کام کر چکے ہیں اور دونوں ہی ایک بولیٹ پروف کار میں بیٹھ کر پاس کے گاؤں میں شوٹنگ کے لیے جا رہے تھے جب ان کی کار ایک ٹریفک جام میں یوں پھنس گئی تھی گویا تین گھنٹے کار میں قید ہو کر نہ ایک میٹر آگے جا سکے تھے اور نہ ہی پیچھے ہٹ پائے تھے۔

ڈرائیور نے کسی سے پوچھ کر دونوں کو یہ اطلاع دی تھی کہ دو کالج کے لڑکوں کی دوستانہ بحث چند سڑک چھاپ غنڈوں کے اُکسانے کی وجہ سے پہلے تکرار میں بدل گئی تھی اور بعد میں دنگے فساد کا ایک سنگین مواد بن گیا تھا۔

حالات پر روشنی ڈال کر واقعات یوں بیان کیے کہ بحث کی شروعات ہی دو مقبول ترین فلم اداکاروں کے بارے میں ہوئی تھی جن میں ایک ہندو ہے، دوسرا مسلمان۔ بحث کرنے والے لڑکوں میں بھی ایک ہندو اور دوسرا مسلمان تھا اور کون کس کو بہتر ایکٹر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ یہ چند سیاسی کارکنوں نے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کی خاطر خود ہی یہ طے کیا تھا کہ ہندو لڑکا ہندو ایکٹر اور مسلمان لڑکا مسلمان ایکٹر کو نمبرون یعنی اوّل نمبر اسٹار ہونے کے جواز پیش کرتے کرتے لڑ پڑے تھے۔

دونوں کو زخمی حالت میں اسپتال لایا جا چکا تھا اور دو فرقہ پرست طبقے ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے والے نعرے لگاتے لگاتے سڑک پر موجود اور دور سے آئے ہوئے لوگوں کو بہکا کر فسادات، لوٹ مار اور خون ریزی کے سلسلے شروع کر چکے تھے۔ دُور دُور تک کاروں میں بیٹھے لوگ کاروں کو چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی خاطر جب بھاگ رہے تھے تو شر پسند عناصر واقعے کو سنسنی خیز بنانے کے لیے اندھادُھند سنگ ساری میں لگے رہے جوش و خروش کے ساتھ!

حالانکہ ایکٹروں کے ساتھ سرکاری و غیر سرکاری محافظ تو تھے لیکن مصلحتاً ان کے محافظ گولیوں کی بجائے سیٹیاں بجا کر اُن کے ہر قدم پر ان کا تحفظ کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر چونکہ دونوں

مایۂ ناز ایکٹر دیہاتیوں کے حلیے میں تھے اس لیے وہ عام لوگوں کی طرح فسادات کے تنگ ہو چکے دائروں میں آ گئے!

شام کو میڈیا والوں نے اس واقعے کو زیادہ سنسنی خیز بنانے کی خاطر یہ خبر سرخیوں میں دی کہ ملک کے مقبول ترین اداکاروں کو بُری طرح زخمی کر دیا گیا ہے اور ہر چینل یہ دعویٰ کرتا رہا کہ ایسے سانحے کی خبر انھوں نے پہلے دی اور وہ ہر آدھے گھنٹے کے بعد ان کی صحت کے بارے میں اطلاع دیتے رہیں گے۔

ہاں اُن دونوں لڑکوں کے بارے میں، جن کی دوستانہ بحث ایک جنگ کا الارم بن چکی تھی نہ اُن کی کسی کو فکر ہے اور نہ کوئی اُن کا ذکر کر رہا ہے!

OO

حشر

آخر میں جان گیا کہ نیا باغبان کیا کرنے آیا تھا۔ حیران تھا کہ بچپن سے میری دیکھ بھال کرنے والے باغبان کو کیوں نکال کر یہ اجنبی اس گلستان و بوستان میں داخل ہو گیا تھا!

ہمارے ہاں کہاوت ہے کہ کسی چیز، اصول، خیال، عمل کو تب بدلا جانا چاہیے جب پرانے میں کوئی خامی ہو اور نئے میں کوئی خوبی ہو۔ اب کس میں خامی تھی اور کس میں خوبی یہ میں جان نہیں پایا تھا۔ لیکن اب ــــ؟

یہ سب کیوں ہوا، کب ہوا اور کیسے ہوا یہ ایک معمہ بن کر خزاں آلودہ پتوں کے ہوا کے جھونکوں سے شاخ سے جدا ہوتے ہی بکھر کر یا تو کیچڑ میں دب گیا تھا یا کسی ندی میں بہہ کر سڑ گیا تھا یا پھر جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ مگر قدرت نے اپنا کرشمہ دکھا دیا تو میں نے راحت کی سانس لی۔

میری تقریباً تمام شاخیں کاٹ کر جن چند شاخوں پر اُس نے پیوند لگا کر اُگایا تھا اُس کے پتوں کا رنگ رُوپ اور بو عطر کی طرح کاغذی پھولوں سے اُڑ کر اپنی اصلی صورت میں نظر آ گئے اور مجھے دیکھنے آئے لوگ دنگ رہ گئے!

نئے باغبان کا کرشمہ منظرِ عام پر نہ آیا تو اُس نے خود ہی اپنی پیوند کی گئی شاخوں کو کاٹ کر سیاست کی آڑ میں اپنا بچاؤ کرنا چاہا۔ مکّاری اور جھوٹ کی چاشنی ملا کر!

وہ شاید کامیاب بھی ہو جاتا اور لوگ یہ جان بھی لیتے کہ سرکار نے ایک مہم کو ناکامیاب بنانے کے لیے درخت کی جڑوں میں کوئی کیمیائی کھاد ڈال دی تھی اور میں حالات کا شکار ایک بے زبان درخت، حالات کا اِکلوتا چشم دید گواہ بھی واقعات پر روشنی ڈال نہیں پاتا مگر قدرت کے ایک کرشمے نے شیطان کے چہرے کو عیاں کر دیا۔ یوں سمجھنے والے حالات کو دیکھ کر واقعات کو سمجھ پائے! اور پھر جب ایک بزرگ خدادوست نے جڑوں کو دیکھ کر کہا کہ موسم بہار کا انتظار کیا جائے تا کہ یہ جان لیا جائے کہ جڑوں میں اگر زہر ڈالا گیا ہو تو نہ کوئی نئی شاخ اُگ پائے گی اور نہ کٹی ہوئی شاخوں پر کونپلیں نظر آئیں گی۔ سمجھ دار بہکاوے میں نہ آ کر بہار کا انتظار کرتے رہے۔

اس نے تاکید بھی کی اور اصرار بھی!

بہاریں آگئیں اور موسم کی رنگت وخوشبو لوٹ کر آئی اور چار سو پھیل گئی۔ نیا باغبان یہ دیکھ کر سرحد پار کرتے ہوئے دلدل میں دھنس کر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اپنے آقاؤں کی نظروں کے سامنے زندہ دفن ہو کر مر گیا اور میرا شک یقین میں بدل گیا، یہی کرنے آیا تھا خود ساختہ باغبان۔

اور یہی میں جان چکا ہوں! اور لوگوں کی طرح!

مقابلہ تھا برابری کا۔ وہ تھی قیامت یہ حشر ہوگا۔

OO

ہوش

جو آج ہوا وہ افسرِ اعلیٰ کے ساتھ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔
وہ معمول کی طرح آج بھی اُس عورت کے ہاتھوں کو چومنا چاہتا تھا جس نے رات کا کھانا بنایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر اُس کو اپنائیت کا احساس دلا کر اُس کا قُرب حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یوں تو سکاچ کے تین پیگ پی کر وہ نہایت حلیمی کے ساتھ باتیں کرنے کا عادی تھا مگر آج تیسرے پیگ کے ساتھ ہی وہ اپنے تیور بدلنے لگا تھا۔ وجہ یہ کہ تھوڑی دیر کے لیے جب بجلی چلی گئی تھی تب کچن میں موم بتی کی جل رہی لَو سے اچھلتا ہوا ایک دل کش سایہ دیکھ لیا تھا اور وہ سوال یا فرمائش جو وہ اپنے میزبان سے پانچ پیگ پی کر کیا کرتا تھا۔ وہ تین پیگ پی کر ہی اپنے میزبان یعنی ایک جونیئر افسر سے کرتا رہا۔ جونیئر افسر اپنے محسن افسرِ اعلیٰ کو یقین دلا رہا تھا کہ کھانا اس کی ماں نے بنایا ہے جبکہ وہ اپنی ضد میں اُڑا رہا اور اس کو جھوٹا ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ کبھی اپنائیت کا احساس دلا کر اور کبھی مزاحیہ انداز میں، کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ سائے کو کسی اہم فائل پر اپنے من کے موافق نوٹ کی طرح دیکھ چکا تھا۔ یوں تو میزبان اپنے خاص طور پر مدعو کیے گئے مہمان کی معنی خیز مسکراہٹیں اور جملے سمجھ رہا تھا مگر جب افسرِ اعلیٰ انگارے کی طرح تپنے لگا تو وہ ماں کو افسرِ اعلیٰ سے اس لیے بھی ملانا چاہتا تھا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ ایک ماں اپنے بیٹے کے مسیحا کے درشن تو کرے جس نے اس کو جیل جانے سے بچا لیا تھا۔
جونیئر افسر کا کیس بھی قانونی دائرے میں ایک سنگین جرم تھا۔ اُس نے رشوت لے کر چند لوگوں کو فصل خراب ہونے کے عوض لاکھوں روپے دیے تھے۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں کی یہ شکایت معقول تھی کہ کیا کیڑے بھی دہشت گردوں کی طرح اپنے مخصوص علاقوں میں حملے کرواتے ہیں۔
سمجھ دار لوگوں نے یہ پوچھ تاچھ بھی کی تھی کہ جو فصل خراب ہو گئی تھی وہ ہے کہاں؟ تاکہ اُس کیڑے والے اناج یا فصل سے مرغیوں کا چارہ بنایا جا سکتا ہے۔
جونیئر افسر کے خلاف کئی ایم ایل اے ایک منسٹر اور رائے عامہ کے علاوہ اخبارات اور میڈیا

بھی خلاف تھے مگر قابل افسرِ اعلیٰ نے کیس کو ایسی کروٹ دی تھی جس سے جونیئر افسر کو اس بات کا کریڈٹ ملا کہ اُس کی وجہ سے یعنی فوری اقدامات سے اڑوس پڑوس کے علاقہ جات کو بچایا گیا تھا۔ عوام چپ ہو جانے کے عادی ہو گئے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہند اور پاک کی سیاسی لڑائی کا فائدہ اٹھا کر کچھ زندہ باد مردہ باد کے نعروں سے ڈرا کر، کچھ حکومت سے اپنی ہمدردی دکھا کر اور کچھ اپنے آپ کو ہٹ لسٹ پر دکھا کر بندر بانٹ کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اس لیے اِن اَن لکھے قانونوں کے تحت کسی کو سزا کیسے مل سکتی ہے، کیونکہ افسرِ اعلیٰ نے ملازم کو بچایا تھا، بچاؤ کا فارمولہ آزمودہ ہونے کی وجہ سے آسانی سے ختم ہو چکا تھا یعنی ختم کروا دیا تھا۔

یوں تو افسرِ اعلیٰ بہت ہی ہر دلعزیز ہیں۔ وہ اپنے عہدے کے برابر لوگوں کی دعوتوں کو قبول کریں یا نہ کریں، چھوٹے ملازموں کی دعوتوں کو فوراً قبول کرتے ہیں، ہاں وہ یا تو پیتے نہیں۔ ماحول اپنائیت کا ہو تو صرف اسکاچ وہسکی پیتے ہیں۔ دو پیگ تک حلیمی سے بولتے رہتے ہیں اور یکسانیت کی باتیں کرتے ہیں۔ اپنے رُتبے اور عہدے کو بھول کر کبھی کسی ایک کمرے والے ملازم کے گھر جا کر فرش پر بیٹھ کر چپراسی کے ساتھ بھی چائے پی لیتے ہیں۔

آج رات بھی ایک جونیئر افسر کے گھر میں گھستے ہی کالونی والوں نے احتراماً خوش آمدید کہا تھا لیکن عام طور پر جو حالت ان کو پانچواں یا چھٹا پیگ پینے کے بعد ہوتی ہے اور میزبان احتراماً اپنے ہی گھر میں رات بسر کرواتے ہیں، وہ آج چوتھا پیگ اٹھاتے ہی ہو گئی۔ اور دہکتا ہوا انگارہ اپنے میزبان کی روک ٹوک کے باوجود کچن میں داخل ہوتے ہی بار بار پوچھتے رہے کہ وہ ماتا جی کے پاؤں چھونا چاہتے ہیں مگر جونیئر افسر کو معلوم تھا کہ افسرِ اعلیٰ کے دل میں چور ہے۔ اس لیے آخر بول ہی پڑا کہ ماتا جی کے ساتھ ان کی ایک طالبہ ہے جو ان کی مدد کرنے آئی تھی اور گزارش کی کہ وہ لڑکی کو اس کے گھر چھوڑ آنا چاہتا ہے مگر افسرِ اعلیٰ کوئی جواب دیے بغیر اشارتاً لڑکی کے نہ جانے کی ضد پکڑ کر چسکیاں لیتا رہا اور ایک عیاش نواب کی طرح حور کے چہرے سے حجاب سرکا کر اُتارنا چاہتا تھا۔ جونیئر افسر پہلے احترام سے اور پھر چال بازیوں سے افسرِ اعلیٰ کی پیش قدمی روکنے کی سعی کرتا رہا۔

افسرِ اعلیٰ یہ جان کر آگ بگولا ہو کر دو پیگ ایک ساتھ پی کر گرجنے لگے۔ ''تم چھوٹے ملازم جھوٹ بولنے کے عادی ہو گئے ہو۔ دفتر میں جھوٹ، سڑکوں پر جھوٹ، محفلوں میں جھوٹ، میٹنگوں میں جھوٹ، اب تمھارا کیس پھر سے دیکھنا پڑے گا۔ بیوی کو ماں کی طالبہ بتا کر کیا سوچا تھا؟ بیوی کو

میرے ساتھ رات گزانے پڑے گی؟ اگر ایسا سوچا ہے تو غلط۔نہیں سوچا ہے۔اس کی مسکراہٹیں زہرآلودہ تھیں۔

جلدی فیصلہ کرو۔ میں اگر تشنگی لے کر چلا گیا تو کل تمھارا کیس ری اوپن کرنے میں دیر ہوجائے گی۔دراصل ٹوائلٹ جانے کے بہانے کچن میں ایک حسین پیٹھ پر لہراتے ہوئے بال دیکھ اپنی بے صبری کا مظاہرہ کر کے ایک ساتھ تین چار وہسکی کے پیگ پی کر نہایت گھٹیا گیت گنگنانے شروع کر کے جب جونیئر افسر کے اعتراض اور احتجاج کے باوجود ایک فاتح کی طرح مگر نشے میں چور ہو کر کچن میں داخل ہوا اور گرج کر بولتا رہا۔ ''روکو گے تو تمھارا کیس ری اوپن کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا مجھے!'' بیٹا اپنی ماں کی نظروں سے گر گیا تھا اور اس کو کچن سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا رہا جبکہ افسرِ اعلیٰ لڑکی کو دبوچنے کی خاطر لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔اور لرزرہے الفاظ سے دھمکا رہا تھا۔ ''کیس ثابت ہوگا تو پھر جیل جانا پڑے گا۔نوکری تو گئی۔سمجھ لو۔'' یہ سن کر جونیئر افسر کی ماں لڑکی کے سامنے کھڑی ہو کر چلانے لگی ''میرے بیٹے کو بچانے کے لیے میں حاضر ہوں، خبردار جو میری طالبہ کو چھوا۔میری بیٹی جیسی ہے۔'' لڑکی نے پلٹ کر دیکھا تو برق کی طرح افسرِ اعلیٰ پر برس پڑی مگر اپنے باپ کی آنکھوں میں ہوس کے انگارے دیکھ کر وہ لرز اٹھی اور اپنی پروفیسر سے لپٹ گئی مگر شکاری نے شکار کو دبوچ ڈالا۔کشمکش جاری رہی اور لڑکی کی صدائیں بے صدا ہو کر رہ گئیں۔

جونیئر افسر اپنے مطلب پرستی کے بوجھ کے نیچے دب کر خاموش تو تھا مگر وہ اپنی ماں کے رویے سے ناخوش تھا خاص طور پر تب جب لڑکی کے بچاؤ کے لیے ایسی جدوجہد کر رہی تھی اور اس کے افسرِ اعلیٰ کی شان اور آن بان کو نظر انداز کر کے اُکسانے والے جملوں کا استعمال کر کے لڑکی کو ایک شیطان کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے غصّے سے بولتی جارہی تھی، مثلاً ''کتوں کے لیے جنسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ماں بیٹے، بھائی بہن، باپ بیٹی کے رشتوں کے بارے میں سوچتے ہی نہیں ہیں۔تم تو انسان ہو!''، ''انسان نہیں شیطان ہو! درندے ہو!''، ''ہوش میں آجاؤ، میری یہ طالبہ تمھاری بیٹی ہے! کیا تم اپنی بیٹی اور اپنے خون کی شناخت بھی نہیں کر سکتے؟'' افسرِ اعلیٰ کی آنکھوں میں ہوس کے انگاروں کی دہک تھی اور جسم میں ایک شکاری کی قوت۔اس لیے عورت کو دھکا مار کر بے ہوش کر گیا تھا۔

عورت جب ہوش میں آئی تھی تب کچن کے کونے میں گئی رات تک سوچتی رہی کہ باپ

ہوش میں آ گیا ہوگا یا بیٹی بے ہوشی میں گھر پہنچا دی گئی ہوگی؟ اس سے پہلے کہ وہ اپنے خدشات پر لگام لگا سکتی اُس کے اندیشوں کا تعاقب کرنے والے چند سوالات نے اُس کو سکتے میں میں ڈال دیا۔

کیا انسانی رشتوں کی قدر کرنے والے کبھی، کسی وقت یہ سوچنے کی کوشش کر سکیں گے کہ شیطانی جوش کو خون کے رشتے ہوش میں آ کر ٹھنڈا کر دیں؟ کیا ایک ظالم باپ کے ضمیر کو مظلوم بیٹی ہوش میں آ کر جگا سکے گی؟ کیا ہوش جوش پر حاوی ہو کر انسان کو حیوان بن جانے سے روک سکے گا؟

اچانک عورت کا جوش ٹھنڈا ہو کر یوں محسوس ہوا جیسے ہوش میں آتے ہی چند جملے حلق میں اچانک پیدا ہوئے کانٹوں کی وجہ سے بول نہیں پائی۔ یعنی یخ بستہ ہونٹ بند رہے اور وہ خون کے رشتوں کے حوالے سے یہ سوچتی رہی کہ اگر ایک باپ جوش میں آ کر اپنی بیٹی کی آبرو لوٹ سکتا ہے تو ایک ماں جوش میں آ کر اپنے مجرم بیٹے کو کیوں بچا رہی ہے؟

OO

واردات

ایک تو واردات ہی انوکھی ہے اور پھر گواہ الو تھے۔ کیونکہ تاریکیوں میں جو انسان دیکھ نہیں پاتا وہ الو دیکھ سکتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ واردات میں ملوث ایک الو ہی تھا اور وہی شکار بھی ہو چکا تھا!

الو تو بے وقوفی کی ہی نہیں بلکہ بدشگونی کی بھی علامت ہے اس لیے انسان اُس سے نفرت کرتا ہے جبکہ دنیا کے الو اپنی اس کمزوری کی وجہ سے احساسِ کمتری کے شکار ہیں، یہ الو اپنے آپ کو سمجھ دار بلکہ ایک دانشور سمجھ رہا تھا، جواز یہ تھا کہ اگر ہزاروں انسانوں میں ایک دانشور ہو سکتا ہے تو لاکھوں الوؤں میں ایک دانشور کیوں نہیں ہو سکتا؟ جبھی تو وہ اکثر بڑے گھروں کے آس پاس رہ کر بڑے لوگوں کی باتیں سنا کرتا تھا اور بار بار نظر آتے ہی بھگایا جایا کرتا تھا۔ کئی تجربات کے بعد وہ کل رات ایک اونچی عمارت کے ساتھ چپکے ہوئے ایک سر بہ فلک درخت کی گھنی شاخوں اور پتوں میں چھپ کر اس گھر میں امریکہ سے آئے ہوئے ایک مہمان کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔

مہمان گھر والوں کو یہ بتا رہا تھا کہ مغرب میں الو کو خوش قسمتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ جان کر دانشور الو خوشی سے جھوم کر اپنی موجودگی کو ظاہر کر کے گھر والوں کی سنگ ساری کی وجہ سے مشکلاً اپنی جان بچا کر اس سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ کیوں نہ مشرق سے مغرب چلا جائے، ایک جھنڈ کی شکل میں، ویسے ہی جیسے مرغابیاں شدت کی سردی سے بچنے کے لیے شمال سے جنوبی علاقہ جات میں آتی جاتی رہتی ہیں۔ مگر راستوں کی جانکاری حاصل کرنے کی خاطر وہ آج شام ہوتے ہی اپنی زبان پر تالا لگا کر امریکہ سے آئے مہمان کی باتیں سننے آیا تھا تا کہ باتوں باتوں میں اس کو مغرب کی طرف جانے کی معلومات حاصل ہو جائیں۔ لیکن آج گھر میں سنسنی خیز ماحول تھا اور حالات کے لیے کل رات اُس کی موجودگی اور اونگھنے کو بُرا تاثر سمجھا جا رہا تھا۔ امریکہ سے آئے ہوئے مہمان کی مخالفت کے باوجود بھی الو کو بدشگونی کی علامت مان کر بُرے انجام کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے ہوئے خوف زدہ ہو رہے تھے۔

ہوا یوں تھا کہ گھر کے ایک نوجوان نے صبح سویرے سیر پر جا رہے ایک بزرگ کے پوتے کو

بچاتے بچاتے اپنی کار سے اس کے کتے کی پچھلی دو ٹانگوں کو کچل ڈالا تھا۔ بزرگ نے اپنے بے قابو پوتے کو بچانے کے لیے کار کے ڈرائیور کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے اپنے پالتو کتے کو زندگی بھر کے لیے اپاہج بنانے کے لیے اپنے موبائیل فون پر حیوانات کا تحفظ کرنے والی این جی او کے تمام عہدیداروں کو جائے واردات پر لا کر ایک لاکھ روپے کا دعویٰ کر دیا ہے۔ یہ سن کر امریکہ سے آئے مہمان نے غصے سے ٹوک کر کہا تو ایسے کتے کو گولی مار دینی چاہیے۔ ویسے بھی ڈرائیونگ کا اصول ہے کہ انسان کو بچانے کے لیے اگر کتا مر جائے تو افسوس کے علاوہ کچھ نہیں کرنا چاہیے، امریکہ میں کتوں کے جسم پر ریبس کو دیکھ کر ایک رات میں ہزاروں کتے مار دیے گئے جن میں بیشتر کتے لوگوں کے پالتو تھے۔ اگر پرندوں کو بھی چھوت چھات کی بیماری ہو تو ان کو بھی، چاہے وہ پالتو ہوں یا آوارہ پرندے۔ بلکہ اگر الو ہوں تب بھی۔ یہ سن کر بے چارہ سمجھ دار الو گر گیا اور گر کر مر گیا۔

اس واردات کی تفتیش کرنے نہ پولیس آئی نہ حیوانوں یا جانوروں کا تحفظ کرنے والی کسی تنظیم کا رکن آیا اور نہ کسی الو نے صدمے کی وجہ سے نوحہ خوانی کرنے کی جرأت کی۔

○○

مریض

نگاہیں ملانے کی کوشش کرنے سے پہلے مسیحا نظروں کے بھنور میں پھنس کر اپنی جان بچانے کی خاطر یوں اپنے چیمبر (Chamber) سے باہر آ گیا، گویا اس نے مریضہ کی نیلی نیلی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں جھانک کر ایک شیطانی آگ کی تپش محسوس کی تھی۔

مریضہ کے چہرے پر ڈراؤنی مسکراہٹ تھی مگر اُس کے ساتھ آیا ہوا اس کا شوہر ڈاکٹر کی نگاہوں کے تاثیر مسیحائی کا کرشمہ نہ دیکھنے کی وجہ سے کچھ اپنی اور زیادہ مریضہ کی بدبختی پر آنسو بہا رہا تھا جبکہ ڈاکٹر کے چیمبر کے باہر انتظار کر رہے ذہنی مریضوں کی لمبی قطار تجسس، تذبذب اور خدشات کے شکار ہو کر ایک ہجوم بن کر دوڑ رہے ڈاکٹر کا پیچھا کر رہے تھے۔

امریکہ سے لوٹ کر آئے ڈاکٹر کو لوگ پاگلوں کا ڈاکٹر نہیں سمجھا کرتے کیونکہ وہ نہ تو مریضوں کو عذاب دِہ برقی جھٹکا دیتا ہے نہ مریضوں کو تاریک کمروں میں زنجیروں میں جکڑ کر رکھنے کے مشورے دیتا ہے بلکہ وہ کسی بھی مریض یا مریضہ کو پاگل خانے بھیجنے کی صلاح دیتا ہے۔

وہ بیمار کی آنکھوں میں جھانک کر دماغی انتشار دل میں اُتار کر نفسیاتی طریقوں سے راحت پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ کامیاب طریقۂ علاج اس نے امریکہ میں سیکھ لیا ہے۔ جس کی وجہ سے اُس کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی ہے۔ بزرگ لوگ اس کی کرامات کو خاندانی کرشمات کا ایک ورثہ مانتے ہیں کیونکہ ڈاکٹر کے خاندان والے جانے مانے حکمت کے ماہرین تھے۔ نبض دیکھ کر بیمار کو ان قصوں کا حوالہ دیا کرتے تھے جس کو وہ اپنوں سے بھی پوشیدہ رکھا کرتے تھے اور یوں ان کا علاج کیا کرتے تھے۔

آج بھی وہ اپنے معائنہ کرنے والے کمرے میں داخل ہوا تھا اور معمول کی طرح اپنی باری کا انتظار کرنے والے بیماروں کو تسلیاں دے کر یا دل جوئی کر کے، ہر بیمار کو ایک مہکتا ہوا تازہ پھول دے کر اپنی پہلی مریضہ کے آمنے سامنے بیٹھ کر نگاہیں ملانے کے لیے بیٹھا تھا جبکہ مریضہ کا شوہر پردے کے ایک کونے کو اپنی چٹکی دبائے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

مریضہ نے نئی پوشاک پہن رکھی تھی مگر اس نے اپنے لمبے میلے ناخنوں سے کھرچ کر اپنے سلجھے ہوئے بالوں کو یوں اُلجھا دیا تھا کہ آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر جب پردہ اٹھا دیا تو مریضہ کی آنکھیں دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گیا تھا حالانکہ مریضہ مسکرا رہی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ دس سال پہلے تب مسکراتی رہتی تھی جب ڈاکٹر نے ایک ڈاک بنگلے میں بارہ سال کی ذہنی طور پر مفلوج چوکیدار کی بیٹی کو یوں دبوچ لیا تھا گویا برف باری میں اندھی ہو چکی ایک مرغابی کمرے میں داخل ہو چکی ہو۔ تب لڑکی لہولہان ہو کر بھی مسکرا رہی تھی۔ لیکن تب لڑکی کی آنکھوں میں کشش تھی اور مسکراہٹ میں لپٹ کر چمٹنے کی دعوت تھی جو دراصل بیماری کی علامتیں تھیں۔ مگر اب اُن آنکھوں میں ایک بھیانک حادثے کے عکس تھے جو ڈاکٹر دیکھ کر خود اپنے وحشی پن سے لرز اٹھا تھا۔ اس لیے وہ خود اپنے انجام کے عبرت ناک مناظر دیکھ کر مریضہ سے نگاہیں ملاتے ہی نظروں کے بھنور میں پھنس کر خود ایک ذہنی مریض بن کر اپنے ہی تاثیرِ مسیحائی کے چیمبر سے نکل کر دوڑ پڑا ہے کیونکہ مرض اس کا تعاقب کر رہا ہے!—!!

OO

برسوں بعد!

یادوں میں شوخیاں ہوں تو ان کو سینے سے لگائے رکھنا اچھا لگتا ہے۔ مگر اگر یادوں میں تلخیاں ہوں تو ان کو بھلا دینا ہی بہتر!

لیکن آج اپنے سامنے ایک فالج زدہ جسم اور چہرہ دیکھ کر بیس برس پہلے گزر چکا واقعہ جب سامنے آیا تو میں اپنے آپ کو یہ سمجھا کر کہ جو گزر گیا اُس کو بھلا جانا چاہتے ہوئے بھی یاد آنے سے روک نہیں پایا!

شکار اور شکاری کے چہرے شناسا تھے! تب بھی اور اب بھی — تب شکار کا چہرہ لہولہان تھا اور اُس کا بے جان جسم سڑک پر پڑا تھا۔ اِرد گرد کھڑے لوگوں کی آنکھوں میں دہشت کے تاثرات تھے مگر چہروں پر مصنوعی سی مسکراہٹیں تھیں! پھیکی پھیکی!

شکار کی کھلی آنکھوں میں کسی بھی زاویے سے، خوف یا خطرے کے تاثرات کی بجائے ایسے تاثرات تھے گویا ایک ہرن نے شیر کو اپنائیت کا احساس دلا کر یہ پوچھا ہو کہ شیر بھائی! آپ کے چمکیلے دانتوں کا راز کیا ہے؟

کون سا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتے رہتے ہو۔ بڑے بھائی؟

شیر نے جواب دینے کی بجائے ہنس رہے ہرن پر حملہ کر کے ایک ہی وار میں اُس کو ہنستے ہنستے ابدی نیند سُلا دیا تھا — اور لاش کے اِرد گرد میں بھی تھا۔

اجنبی لوگوں اور شناسا لوگوں کی طرح میری نظریں بھی شکار کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

حالات عام روش سے ہٹ کر تھے! اور میں اپنی عادات سے مجبور ہو کر بڑبڑاتے ہوئے، ہاتھ میں ایک ریوالور لیے شکار کے چہرے کو بھی دیکھ کر ساتھ والے تماشائی کو بتا رہا تھا کہ شکار اور شکاری دونوں ایک ہی محلّے میں رہتے ہیں۔

دونوں ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں حصّہ لیا کرتے تھے! پھر اچانک ایسا کیا ہوا جو دوست نے دوست کو بے رحمی سے مار ڈالا —!

یہ تو درندگی کا مظاہرہ ہے! ہم لوگ تو زخمی بھیڑیے کو بھی مرہم لگانے کے لیے مشہور ہیں! آگ سے اَدھ جلے کو برا سانپ کو نکالتے نکالتے اپنے آپ کو داؤ پر لگنے کے عادی ہیں۔

شکاری، جو مجھے جانتا تھا، ہمارے قریب آ کر مجھ سے کچھ پوچھنے کے بجائے میرے شانوں سے شانے ملا کر کھڑے دو جوانوں سے پوچھ تاچھ کرنے لگا تھا اور جواب نہ ملنے پر گرج کر بول پڑا تھا۔

"بول کیا کہہ رہا ہے یہ دِلوں کا ڈاکٹر؟"

میرے ساتھ کھڑے آدمی نے کہا کہ میں شکاری کے نشانے کی تعریف کر رہا تھا! گولی ماتھے پر لگی ہے! اگر نشانہ چوک جاتا تو شکاری کی آنکھ زد میں آ جاتی! شکاری نے دوسرے آدمی سے پوچھا تو اُس نے مصنوعی جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلے آدمی کی تائید کی تھی۔

اور مجھے شکاری کے عتاب سے بچا لیا تھا۔ ورنہ میں آج یہاں نہ ہوتا!

شکاری کا پیس میکر (Pace Maker) میری ہی سفارش پر دہلی کے بڑے اسپتال میں فٹ کرایا گیا تھا کیونکہ تب میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یہاں آیا تھا اور اُس سانحہ کے بعد میں اپنی جان بچانے کی خاطر، اپنے گھر کے اُجڑنے کے بعد اُکھڑ کر ہجرت کر کے یہاں آ گیا تھا۔

اور اب یہاں کا ہی ہو کر رہ گیا ہوں!

شکاری سن سکتا ہے، مجھے پہچان سکتا ہے مگر نہ بول سکتا ہے اور نہ اپنی شدتِ درد کو اشاروں سے سمجھا سکتا ہے۔ مگر ملتجی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں درد تو کیا کرب آشنا ہونے کی بدولت شکاری کے کرب کی شدت محسوس کرتے ہوئے علاج کے لیے تمام اہم تحقیقات کرانے کا حکم دے کر پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں شکاری کے مکمل علاج کا سارا خرچ اپنے نام کروانے کی رضامندی دے چکا ہوں۔ ایک اچھا انسان بن جانے کی خاطر! یا پھر انسانیت کے نام!! — برسوں پہلے بھی اور برسوں بعد بھی!! یہی ہماری خصلت ہے، روایت ہے اور فطرت ہے —!!

OO

ضد

میں اُس کو سمجھانے کی کوشش کرر ہا تھا کہ کائنات میں ہر جاندار میں نَر اور مادہ ہوتا ہے— انسانوں میں، حیوانوں میں، پرندوں میں، کیڑے مکوڑوں میں، بلکہ پودوں میں، درختوں میں بھی—!

شیو شکتی کا نام دیں، آدم حوّا کا نام دیں، جسم اور جان کا نام دیں۔ ایک نر ہوتا ہے اور دوسری مادہ—!

یا انگریزی میں ایک میٹر Matter ہوتا ہے اور دوسری انرجی Enerey ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے وابستہ ہیں۔

وقت کے ساتھ ان کی شناخت ضرور بدل جاتی ہے لیکن تاثر نہیں بدلتا۔ وہ اپنے عقیدوں کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے اُس اَن دیکھے نَر مادہ کی بات کر رہا ہے، جس کا ذکر ہمارے کالج کے زمانے میں ایک بار بار فیل ہونے والا، ہم سے عمر میں چھ سات بڑا لڑکا اکثر کیا کرتا تھا۔ اور للکار کر کہا کرتا تھا کہ میری تن من اور دھن سے کی گئی خدمات کے عوض جس دن چنکاری بابا نے مجھے نَر مادہ دے دیا میں اپنے شہر کی سب سے حسین لڑکی کو چھو کر اس کو اپنے بس میں کرلوں گا—! عیاشی کرلوں گا، نر مادوں سے چھُو کر عزت داروں سے عزت چھین لوں گا، شہرت والوں سے شہرت اور دولت والوں سے دولت چھین لوں گا!

گویا تب وہ اپنے آپ کو الٰہ دین اور نَر مادہ کو ایک جادوئی چراغ ظاہر کیا کرتا تھا۔ میں نے دلچسپی دکھا کر جب کرید کی تھی تب اُسے یہ بتایا کہ نیولے اور کسی اور جانور کے جسم کے دو ٹکڑوں کو ساتھ رکھ کر چنکاری لوگ 'نَر مادہ' کو اتنی طاقت دیتے ہیں گویا ہائی وولٹیج کی کرنٹ جو شیر ببر کو بھی ایک انسان کے اشاروں پر نچا دیتی ہے۔ میرے دوست کو اُس کی باتوں پر تب بھی یقین تھا اور اب بھی ہے جبھی تو وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ کروڑ پتی ہوتے ہوئے بھی سادھوں سنتوں، پیروں فقیروں کی خدمات اپنے سکون کی خاطر کرنے کی بجائے اُن سے کوئی 'نَر مادہ' جیسی چنکاری تعویذ، انگوٹھی یا

ایک مالا حاصل کرنے کی سعی کرتا رہتا ہے۔

بلکہ جس کو ضرورت منداُس کا 'دان' یا زکوٰۃ کا نام دیتے رہتے ہیں وہ اس کے منصوبے کو دُعاؤں سے مضبوط بنانے کے انسانی وسائل ہوتے ہیں۔

یہ تو شہر والے جانتے ہیں کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران اُس کا پردادا ایک مندر کا پجاری تھا جو امرناتھ یاترا پر آئے ہوئے ننگے باباؤں کی بہت خدمت کیا کرتا تھا۔ کچھ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک بابا نے اُس کو زمین میں دَبے ایک مٹکے میں چھپے سونے کے سکّوں کا پتہ بتایا تھا جبکہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ چمتکاری بابا نے اُس کی بنجر زمین کو آباد کر کے اُس کو راتوں رات ایک امیر تاجر بنایا تھا۔ دونوں میں منطق ہے۔ جو بھی ہوا تھا میرا دوست اُسی تجارت کی بدولت آج کروڑ پتی ہے۔

میرے دوست کی سب سے اچھی خوبی یہ ہے کہ وہ جہاں بھی جاتا ہے مجھ سے رابطہ قائم رکھتا ہے۔ بیرونی ممالک کے ہر دورے کے بعد وہ میرے ساتھ ایک دن سے دس دن تک رہتا ہے۔ ہمارے ہونے والے سفر کو وہی ترتیب دیتا رہتا ہے۔

بدبختی سے ایک زبردست برفیلے طوفان سے ہم ایک دوسرے بچھڑ کر جب دس دن بعد ملے تھے تب میرے دوست نے ہم سے ہمارا حال جانے بغیر اپنی کہانی سنا ڈالی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ وہ برف میں دھنس کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

پھر ہوش میں آنے کے بعد برف کے اندر کُریدی ہوئی۔ ایک گھپا کے اندر رہنے والے ایک ادھیڑ عمر کے ایک ننگے بابا نے اُس کو اشاروں میں سمجھا دیا تھا کیونکہ وہ بولتا نہیں تھا۔ میرا دوست بہت ذہین ہے اس لیے اُس نے بابا کی دل لگا کر خدمت کی تھی اور چھٹے روز وہ بابا کا آشیرواد لے کر شہر لوٹا تو تھا مگر پھر بابا سے ملنے کی خاطر۔

چند روز بعد وہ کسی مددگار کو ساتھ لیے بغیر اور مجھے بتائے بغیر اپنے کندھوں پر کاجو، بادام، شہد، اخروٹ کے علاوہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں چندن کی لکڑیاں لے کر بابا کے چہرے پر ایک متاثر کن چمکیلی مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔

میرے دوست نے جان بوجھ کر نَر مادہ کا ذکر کیا تھا یہ سوچ کر کہ بابا کیونکہ بولتا نہیں اس لیے وہ 'نَر مادہ' دکھا دے گا۔

تب وہ پاؤں پکڑ کر اُس سے نَر مادہ بطور جزا لے گا۔ اور پھر دنیا کی حسین ترین عورت کو اپنے بس میں کر لے گا۔ دل بھر جائے تو دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور عورت کو اپنے بس میں کر کے

خاقان بن جائے گا۔

جب وہ یہ سب سوچ رہا تھا، اُس کی نگاہیں بابا کے چہرے کے بولتے تاثرات پر جمی رہتی تھیں۔ بابا نے اشارتاً یہ بتا دیا تھا کہ وہ منہ مانگی چیز سحر کے وقت لینے آئے تو مل جائے گی۔

مگر میرا دوست رات گپھا کے باہر گزار کر جب گپھا کے اندر گیا تھا تب بابا اندر تھا ہی نہیں—! حالانکہ سحر اُفق پر کھڑی تھی—!!

اگر وہ اپنی خواہشات کا عکس دیکھ رہا ہوتا تو گپھا کے اندر ایک کونے میں، ڈھنگ سے رکھی وہ تمام چیزیں نہ ہوتیں— جو وہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر، بابا کے لیے لایا تھا! کتنی راتیں گپھا کے اندر، باہر اور تاک میں رہتے ہوئے اِرد گرد رہ کر وہ نہ بابا کو تلاش کر سکا تھا اور نہ گپھا برف پر کسی انسان، حیوان یا پرندے کے پاؤں کے نشانات دیکھے تھے۔ میرے دوست نے!

لیکن اُس کو یقین ہے کہ بابا کے پاس 'نَر مادہ' تھا اور وہ کسی بھی قیمت پر بابا سے وہ لے کر ایک منجھی ہوئی چٹکی سے نکلے تیر سے خود ہی اپنا کاتبِ تقدیر بن جانا چاہتا ہے۔ وہ مجھ سے مدد مانگ رہا ہے لیکن میری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ اپنی سناتا رہتا ہے میری سنتا نہیں ہے!

اگر اس کے پڑدادا کو زمین میں دَبا خزانہ ملا تھا تو اس کو کسی نے وہاں دفن کیا ہوگا۔ کھنڈروں میں بھی سکّوں سے بھرے مٹکے ملتے ہیں۔

اگر انسانی صلاحیتوں سے مٹی کا ذائقہ جان کر یہ پتہ چلتا ہے کہ نیچے تیل ہے تو کسی کو خزانے کے بارے میں چلتے چلتے پتہ چلتا ہے۔

کسی جانور کے کسی حصّے کو نَر اور دوسرے جانور کے کسی حصّے کو جوڑ کر نہ کوئی قوت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ کوئی ایجاد!

ہو سکتا ہے یہ کوئی علامت ہو— زندگی کی باریکیوں کو سمجھنے کی؟ کیا معلوم بابا یا اس کی گپھا اُس کی خواہشات کا عکس ہو!

وہ یہ جانتا ہے کہ کسی نابینا کو کسی کی دان کی گئیں آنکھیں بینائی دے سکتی ہیں۔ کسی تانترک کے مشورے پر کسی بچّے کی آنکھیں نکال کر نہیں—!

'نَر مادہ' کالج کے اُس نیم جنونی لڑکے نے بھی کبھی دیکھا نہ تھا— ہماری بات ہی اور تھی۔ بلکہ میرا ذہین دوست کتھاؤں اور حکایتوں میں بھی کرید کرید کر علامتوں کا مفہوم نکالا کرتا تھا!

کیا ایک ہی ملاقات میں وہ اتنا بدل گیا کہ جس 'نَر مادہ' کو وہ ایک ڈھکوسلہ سمجھ کر اُس لڑکے کو

اپنے قریب آنے نہیں دیا کرتا تھا آج ایک چمتکاری بابا سے وہی مانگ رہا تھا۔ کیوں؟

نَر، یعنی مرد، مادہ یعنی عورت! دونوں ایک دوسرے محبت کر سکتے ہیں اور نفرت بھی! دونوں کا ملن زندگی ہے—!

غلیظہ یا غلاظت کے ملن سے زہریلے کیڑے جنم لیتے ہیں جبکہ تتلیاں نَر اور مادہ ایک دوسرے سے خوشبو کے عالم میں تتلیوں کو ہی جنم دیتی ہیں۔

اب کوئی زہریلے کیڑوں یا تتلیوں کو 'نَر مادہ' سے چھولے تو کیا کیڑے جانور بن سکتے ہیں۔

میں حیران ہوں کہ آج وہ خود اپنے قول کو ٹھکرا کر ایک شیطانی شے کو پانا چاہتا ہے اور میرے بار بار منع کرنے کے باوجود بابا کو تلاش کرنے چلا گیا ہے!

سوچ رہا ہوں کہ کیا اُس کی ضد رنگ لائے گی—؟

منطق یہ سمجھا رہا ہے کہ میرا دوست چمتکاری جنتر سے چھو کر حکمرانوں کو اپنے بس میں کرنے کا خواہش مند ہے؟؟

یعنی ایٹمی قوت پر خاقان بننے والوں کو جنتر کے ایک لمس سے اپنے بس میں کر کے آقا بن جائے گا؟

لیکن—؟—یہ کیسا سوال میرے ذہن میں اُبھرا ہے؟ جو ہو رہا ہے یا ہونے جا رہا کہیں وہ میرے دوست کے تصورات سے اُبھری ہوئی ایک گہری چال کے خدوخال تو نہیں ہیں جو اُس کی خواہشات کو پورا کرنے کا یقین دلا رہی ہے؟ — کہیں وہ مذہب کی آڑ میں ایک ایسی نفسیاتی ایجاد کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے جو آج تک کی تمام ایجادات کو مسمار کر کے صدیوں بعد مورخوں کی کھوج کے موضوعات بن جائیں!

OO

آفتوں کے دور میں

میں مکان کی دہلیز پر کھڑا دُور دُور تک نظریں دوڑا کر سوچ رہا ہوں کہ کاش مجھے کوئی انسان، چرند یا پرند نظر آتا جس کے قدموں کے نشان یا پرواز کی سمت دیکھ کر میں جان پاتا کہ کوئی گھر یا گاؤں آس پاس ہے یا نہیں؟

حالانکہ میں یہ نہیں جانتا ہوں کہ میری منزل پاس ہے یا بہت دور، مگر منزل پالینے کی خاطر اپنے قدموں کو آگے بڑھنے سے روکنا نہیں چاہتا ہوں اس لیے میں پلٹ کر کبھی بھی نہیں دیکھتا ہوں مگر آج میرے قدم خود بخود رُک گئے ہیں اور میں بار بار اُس لڑکی کو دیکھتا رہتا ہوں اور بار بار میں رات بھر اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کو یاد کرتا رہتا ہوں!

جو لڑکی رات بھر میرے سینے سے لپٹی رہی۔ اُس کو بِن بتائے ایک لٹیرے کی طرح چلا جاؤں، ایسی میری فطرت نہیں ہے، اس لیے سوچ رہا ہوں کہ آفتوں کے دور میں اس لڑکی کا کیا کروں؟

اپنے چار بچھڑے ہوئے ساتھیوں کی تلاش جاری رکھوں؟

اب تک کے اذیت ناک سفر کے دوران مجھے کل تک تین لڑکیاں یوں مل چکی ہیں گویا کسی اساطیری کتھا یا طلسمی حکایت کی تحریریں تصویریں بن کر مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہوں، یعنی پہلے چھپ کر صاف نظر آئی تھیں مگر پھر جب آمنا سامنا ہوتا رہا تو گھنٹوں اپنے قرب کی ہلکی ہلکی آنچ سے نوازتی رہیں۔

یہ چوتھی لڑکی مجھے کل اس وقت ملی تھی جب شام کروٹ لے رہی تھی۔

پہلی لڑکی سفر کے دوسرے دن ملی تھی!

دوسری لڑکی ایک اذیت ناک سفر کے چوتھے دن ملی تھی۔ اگر وہ نہ ملتی تو میں جسمانی درد اور ذہنی کرب کا بھاری بوجھ لے کر آرام دِہ دن گزار کر اس کو چکمہ دے کر اپنے ساتھیوں کی تلاش میں نشیبی گاؤں کو چھوڑ کر پھر سے پہاڑی کے بالائی حصوں میں دشوار سفر طے کر رہا ہوتا! ہر چھوڑی ہوئی سانس سے ایک اور سانس لینے کی خاطر! مانو ایک معجزہ ہو گیا تھا۔

مجھے ایک مہربان سنیاسن کے ساتھ ایک دن اور آدھی رات گزارنے کا کھٹا میٹھا وقت ملا تھا مگر جو لڑکی ساری رات میرے سینے سے لپٹی رہی وہ چوتھی لڑکی ہے۔ لگتا ہے مجھے اس ملائم چمڑی والی لڑکی سے پیار ہونے لگا ہے اور اُس کے بدن کی آنچ مجھے بھی سہانی لگ رہی ہے۔ ایسی کیفیت کا احساس زندگی میں پہلی بار ہوا ہے! جبکہ اس سے پہلے دورانِ سفر ملی تینوں لڑکیوں کے قرب میں نہ سہانی آنچ تھی اور نہ وہ خوشبو تھی۔ تینوں بہت ہی سندر تھیں۔ دوسری لڑکی ہوا کے جھونکوں سے رقص کررہے ایک کھلے کھلے پھول کی طرح نظر آرہی تھی جبکہ تیسری لڑکی گلدان میں سجائے ہوئے رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ تھی۔ پہلی لڑکی کو میں پہلی ہی نظر میں دیکھ کر جذباتی طور پر اس قدر بہک گیا تھا کہ میرا منزل پالینے کا عزم ڈگمگانے لگا تھا۔ اگر ہماری عمر میں بہت زیادہ فرق نہ ہوتا تو شاید میں اُس کو اپنا ہم سفر بنا کر نئی منزلیں تلاش کرتا۔

دوسری لڑکی ایک بہت ہی امیر باپ کی اِکلوتی اولاد تھی۔ اس لیے جب بھی سامنے سے گزر جایا کرتی تھی اس کے پہنے ہوئے زیورات ہیرے جواہرات یوں نظر آیا کرتے تھے جیسے اندھیروں کو چیرنے والی بجلیاں۔

اپنی خوبصورت آنکھوں سے باتیں کیا کرتی تھی۔ مجھ سے دو تین سال چھوٹی تھی مگر اپنے شاداب بدن کی وجہ سے پُرکشش عمر کی لگ رہی تھی۔

تیسری عورت عمر میں مجھ سے بڑی تھی اور اگر آج کل کی لڑکیوں کی طرح بناوٹ اور سجاوٹ سے رُوپ متی کہلاتی۔ ایک آشرم میں رہتی تھی اور عقیدت مندوں نے اس کو دیوی کا رتبہ دیا ہے اور وہ بھجن کیرتن کیا کرتی تھی یا پھر رشی کی کتھاؤں کی کتابیں سامنے رکھ کر بھگتوں کو رشی کے رٹے ہوئے بھاشن جذباتی لہجے میں سنا کر خود بھی رویا کرتی تھی اور بھگتوں کو بھی رلایا کرتی تھی۔ آفتوں کو پچھلے جنم میں کیے بُرے کرموں کا پھل بتایا کرتی تھی اور انھیں جنم میں اچھے کرم کرنے کی جزا دوسرے یعنی اگلے جنم میں ملنے کی اُمیدیں دیا کرتی تھی۔ وہ اپنے مستقل سیوک کے علاوہ کسی کے ساتھ آنکھیں ملا کر باتیں نہیں کیا کرتی تھی۔ جب بھی وہ بھاشن دیا کرتی تھی کیسری رنگ کے شال سے اپنا چہرہ چھپا کر رکھتی تھی۔

آشرم پہاڑ کی چوٹی پہ تھا اور عقیدت مندوں کو یقین تھا کہ رشی نے اس جگہ کا انتخاب اس لیے کیا تھا کیونکہ وہ پورنماشی کے دن فرشتوں سے باتیں کیا کرتا تھا اور بھگتوں کے مسائل حل کیا کرتا تھا۔ یہ سن کر میرے باغی دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ جس کو فرشتے روپہلی روشنی میں نظر آتے

ہوں اُس کو دن کی روشنی میں بے دردی سے جنگل کاٹنے والے شیطان کیوں نظر نہیں آیا کرتے تھے؟ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ سردیوں میں یہاں کوئی بھی نہیں آتا تھا البتہ پچھلے ساٹھ برسوں سے یہاں سال میں دو بار میلہ لگتا ہے۔ ایک موسم بہار کے آغاز میں اور دوسرا موسم خزاں کے اختتام پر اور مقامی لوگ رشی کی کٹیا کو بکر ماجیت کا تخت سمجھ کر اپنے ساتھ سال بھر رشی کا لنگر چلانے کے لیے چاول، آٹا، گھی، تیل، کمبلیں اور ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کے علاوہ بادام، اخروٹ، کاجو، کشمش وغیرہ دے کر تھوڑی مٹی یا چند سوکھے پتّے لے جایا کرتے تھے۔

یہ باتیں مجھے اس عورت کے سیوک نے تب بتادی تھیں جب میں ایک چالیس سالہ عورت یا ایک کنواری لڑکی سے مل کر خوب باتیں کر چکا تھا۔ وہ اس لیے کہ جب میں نے دروازے پہ دستک دی تھی تب اُس نے اپنا چہرہ چھپائے بغیر اور ٹوپی کے اندر قید لمبے باوقار بالوں کو آزاد کر کے لہرانے کی آزادی دی تھی۔ وہ میرے ساتھ آشرم سے بھاگ کر کہیں دور بہت دُور جانا چاہتی تھی مگر میرا عزم اتنا بلند تھا کہ میں سحر کا انتظار کرنے کی بجائے آدھی رات کو اپنا کھویا ہوا راستہ اور اپنے بچھڑے ہم سفروں کی تلاش میں نکل پڑا تھا اور چلتا رہا یہ جانے بغیر کہ میرے پاؤں کہاں پڑ رہے ہیں۔ ہاں برانڈی کی چسکیاں لیتے ہوئے میں تیسری لڑکی کی دردناک کہانی بھول جانے کی خاطر پہلی اور دوسری لڑکی کے بارے میں یادوں کو تصورات میں دیکھتا رہا۔ گویا خوف پر قابو پانے کے لیے جیسے البم کی ورق گردانی کرتا رہتا ہوں! انجانے راستوں پر ایک کٹھن سفر کرنے والا ایک تنہا مسافر ہوں حالانکہ میرے چار ساتھی تھے اور وہ ایک برفیلے طوفان میں مجھ سے بچھڑ گئے تھے۔ ہم لوگ ایک خاص مشن کو پورا کرنے کے لیے آئے تھے اور اس شیطان کو رنگے ہاتھوں پکڑنے آئے تھے وہ اکثر برف باری کا فائدہ اُٹھا کر جنگل کے بالائی علاقوں میں اپنے تربیت یافتہ لوگوں اور بیٹری پر چلنے والی جدید آریوں سے درختوں کو چھوٹے ٹکڑوں میں برف کی تہہ پر کھینچ کھینچ کر آسانی سے نشیبی علاقوں میں انتظار کر رہی ٹرکوں میں ریاست کی حدوں کے پار لیتا رہتا ہے۔

ہمارا مشن خفیہ ہے اور ظاہری طور پر ہم مرغابیوں کا شکار کرنے آئے ہیں۔ وہ بھی تب بتادینے کی ضرورت پڑ گئی تھی جب جنگل کے دامن میں واقع چھ گھر والے گاؤں والوں نے ہم سے پوچھ تاچھ کی تھی۔ ان کی پوچھ تاچھ ہمارے مقصد کے بارے میں تھی بلکہ وہ بھلے لوگ ہمیں چند حادثات اور رنج و غم کے واقعات کے حوالے دے کر ہمیں جنگل میں متوقع خطرات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ خونخوار جانوروں کے جان لیوا حملوں کے لیے ہم تیاریاں کر کے آئے تو تھے مگر وہ

اُلٹے پاؤں والی ڈائن جو رُوپ بدل کر اپنے شکار کو اپنے ساتھ لے جا کر کھا جاتی یا کسی غار میں رکھ کر اُس کو اپنا غلام بنا لیتی ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس طنزیہ قہقہوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا مگر وہ قہقہے اُس سناٹے کی وجہ سے میرے حلق میں اٹک گئے تھے۔

ایک کچھوے کی رفتار سے میں چل تو رہا تھا لیکن میں کہاں جا رہا تھا مجھے یہ معلوم نہ تھا مگر دھندلی دھندلی روشنی میں جب میں نے دھویں کی لکیریں دیکھیں تھیں تب مجھے اپنے اعتماد پر فخر محسوس ہوا تھا کیونکہ تدبیر نے میری تقدیر لکھ دی تھی، دھواں ہمارے محکمے کی ایک فارسٹ گارڈ ہٹ سے نکل رہا تھا۔ میری کیفیت ان سمندری جہاز میں سفر کرنے والوں جیسی نہیں تھی جنہیں چھ چھ مہینوں تک عورت کو نہ دیکھنے کی وجہ سے تیر رہی مچھلیوں کا اوپر کا حصہ عورتوں جیسا نظر آیا کرتا تھا۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ لکڑی کے مکان میں میرے بچھڑے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے!

لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔

دستک دیتے ہی ایک لڑکی نے دروازہ کھولا اور مجھے سنجیدگی سے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی رہی جبکہ میں لڑکی دیکھتے ہی ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس کی صورت ڈراونی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ اتنی خوبصورت اور باوقار تھی کہ میں اُس کو ایک عجوبے کی طرح اشتیاق اور حیرانگی کے ملے جلے تاثرات سے دیکھتا رہا۔ میں کھلے دروازے کو پکڑ کر کھڑا تھا، تبھی لڑکی نے مجھے اندر کھینچ کر دروازہ بند کر کے غصہ سے کہا کہ وہ کوئی ڈائن نہیں ہے اور یہ کہتے ہوئے مجھے اپنے پیر دکھا کر معصوم لہجے میں مسکرا کر بولی ”دیکھا اُلٹے پاؤں نہیں ہیں، ہاں اگر دروازہ کچھ دیر اور کھلا رہتا تو سرد ہوائیں ہم دونوں کو دبوچ لیتیں۔“

لڑکی کا چہرہ پریوں جیسا تھا، جھیل جیسی گہری نیلی نیلی آنکھیں، گلابی گال اور ہونٹوں پر ایک پُرکشش تبسم۔ ایک آبشار کے مانند مچل رہی شاداب درخت کی بے قابو شاخیں! آواز میں ترنم سے لبریز اعتماد!

”اپنے کپڑوں سے برف جھاڑ کر چولھے کے پاس بیٹھ جاؤ ورنہ برف پانی بن کر تمھارے کپڑوں کو گیلا کر دے گا۔“ اُس نے سخت لہجے میں کہا تھا اور میں نے ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنا اوورکوٹ اُتار کر کمرے کے اندر بندھی رسّی پر لٹکا دیا تھا۔ اپنے لانگ بوٹ اُتار کر کمرے کے ایک کونے میں رکھ کر جب گرم گرم قہوے کی چسکیاں لیں تھیں تب اجنبیت کے اندیشوں اور وسوسوں بلکہ خدشات کو اپنائیت کے جادو نے اپنی شکل دکھانے سے پہلے ہی بھگا دیا۔ حالانکہ جب وہ بولتی

تھی تو بات کا مفہوم سمجھنے سے پہلے کبھی یہ لگتا تھا کہ طنز کر رہی ہے، کبھی لگتا تھا کہ ڈانٹ رہی ہے، کبھی لگتا تھا کہ نہایت شیریں لہجے میں سمجھا رہی ہے۔ مثلاً ''کیوں کسی حکیم نے برف باری میں گھومنے کا مشورہ دیا تھا؟ اور وہ بھی میرے گھر کے اِردگرد؟ یا کسی خونخوار جانور کی صحت ٹھیک کرنے کی خاطر انسان کا گوشت کھانے کی ہدایت دے کر'' — ''چادر چھوٹی نہیں ہے۔ تمھیں اوڑھنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ انگاروں کے قریب بیٹھ کر سردی کو بھگادو۔ انگاروں کو چھولو گے تو جل جاؤ گے؟ جل گئے تو یہ برف بھی درد کی شدت کم نہیں کر سکے گی!''

''برف پر آگ جلائی جا سکتی ہے۔ لیکن آگ پر برف رکھو گے تو لال رنگ کالا ہو جاتا ہے! مگر یہ کالا توا گرم ہے! اس پر میں مکئے کی روٹیاں پکا کر تمھیں کھلادوں گی! میں جانتی ہوں تمھیں بھوک لگی ہے! لگی ہے نا؟ یہ لو اخروٹ، توڑلو نا۔ میں اخروٹ کی چٹنی بنالوں گی۔ اخروٹ دانتوں سے دبا کر توڑے جاتے ہیں۔ ایک دم بدھو ہو، کیوں تمھیں تمھارے ابا نے نہیں بتادیا ہے؟ دانت ہیں یا وہ بھی میں دوں؟ ورنہ شیرنی سے دوستی کرلو، تم اپنا دل اُس کو دو۔ وہ تمھیں اپنے دانت بطور تحفۂ محبت دے گی'' — ''تم چور کو پکڑنے جا رہے ہو جبکہ تمھارے اندر بیٹھا چور زیادہ خونخوار ہے۔ ورنہ بار بار میرے پھٹے لباس کے بجائے میری چمڑی کیوں دیکھتے؟''

وہ اکیلی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا باپ اس علاقے کا راکھا ہے۔ وہ قہقہے لگا کر ایسی بھی باتیں کیا کرتی تھی جن کو سن سن کر میں چونک پڑتا تھا مثلاً یہ کہ ''اس کے باپ کو ڈر رہتا ہے کہ اگر وہ بیٹی کو اپنے گاؤں چھوڑنے جائے گا تو اُس کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے! اتنے بڑے جنگل میں کیا لکڑی کے چور اس کے استقبال کے لیے انتظار کر رہے ہوں گے۔'' دراصل ایسی باتیں ایک دس سال کی لڑکی کے ذہن کی پیداوار تو نہیں ہو سکتیں۔

ہاں یہ اس کے باپ کی بتائی ہوئی باتیں ہوں گی۔

ایک برگد کے پیڑ کے شاخوں کی طرح اس لڑکی نے بھی زمین کو چھو کر خود بخود اپنی جڑیں بنالی ہیں۔ یہ سوچ کر کہ راکھا رات کو بھی گھر نہیں لوٹتا ہے اس لیے شاید وہ بھی میرے ساتھیوں کے ساتھ مہم پہ نکلا ہوگا۔

میں اپنی منزل کے قریب ہوں یہ سوچ کر میں صبح سویرے ہی وہاں سے کھسک گیا تھا اور لڑکی کے بتائے ہوئے نزدیک کے گاؤں کے راستے پر چل پڑا تھا اور دورانِ سفر لڑکی کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔

اُس نے اپنا نام نہ بتایا تھا اور نہ ہی میں نے پوچھا تھا۔ وہ ہندو تھی یا مسلمان یہ بھی میں جان نہیں پایا مگر رات بھر اور دورانِ سفر بھی سراسیمگی کا شکار بنا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ لڑکی خطرات سے آشنا ہوتے ہوئے بھی بنا خوف و خطر ایک پُر کیف زندگی گزار رہی ہے۔ بار بار یہ خیال آتا رہا کہ حوّا نے پھر جنم تو نہیں لیا ہے اور ہر بار یہ سوچتا رہا کہ آدم ایک نئے روپ میں زمین پر آ جائے گا؟! پہاڑی کے دوسری طرف کے علاقے میں بھی زبردست برف باری ہو رہی تھی۔ اتفاقاً مجھے ایک ایسے گھر میں آسرا ملا تھا جہاں ہر طرف امیری کی چمک دمک تھی۔ میرا اندازہ صحیح نکلا تھا کہ یہ گھر بھی کالا دھندہ کرتا تھا مگر جنگلوں کی اندھا دھند کٹائی تو قدرت کے ان لکھے قوانین کی خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ گناہِ عظیم ہے۔ وہ خوب کمائی کرتا ہے مگر غریب پرور بھی ہے۔ اُس کی سوکھی ٹہنیوں پر بن موسم بھی کونپلیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ جب وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی خواہش پوری کر لیتا ہے مگر اُس کی خواہشیں اُس کی دیوانگی کا عکس ہوتی ہیں۔ مجھے پا لینے کی خواہش بھی اُس کا پاگل پن ہے۔ وہ مجھ سے شادی اس لیے نہیں کرنا چاہتی ہے کیونکہ میں خوبرو ہوں۔ ۲۸ سال کا ایک اعلیٰ افسر ہوں۔ ایک اچھے مستقبل کا دعویدار ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس کو میرے بارے میں کوئی جانکاری بھی نہیں تھی۔ بقول اُس لڑکی کے میں ایک مہمان تھا جو اُس کے ساتھ کھیلنے میں دلچسپی لیا کرتا تھا اور بار بار اُس کو جیت دلا کر ہنسایا کرتا تھا۔ جب میں نے ایک دن برف کا ایک مجسمہ بنا کر اپنی ٹوپی اُس کے سر پر رکھ کر اُسے ہنسانے کی کوشش کی تب وہ ننگے پاؤں برف پر چل کر دوڑ کر صحن میں آ کر مجھ سے یوں لپٹ گئی کہ چند لمحوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ سے چپک کر اپنے ابا کو آوازیں دینے لگی ہے۔ گھبراہٹ میں میرا دل زور زور سے دھڑکتا رہا۔

دراصل مجھے روبوٹ کی طرح ہر کام کرنے والی اس لڑکی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بس اس کو تفریح کرانے کی آڑ میں انتظار کر رہا تھا کہ کب برف باری رُک جائے اور میں اپنے مشن کو پورا کرنے کی خاطر اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملنے کی سعی کروں۔

لیکن یہ واقعہ ایک حادثہ بن گیا۔

بیٹی کی صدائیں سن کر باپ بھی دوڑا دوڑا آیا تو لڑکی نے اپنی خواہش کو ضد کی شکل دے دی اور رٹ لگا کر ایک طوطے کی طرح بولتی رہی کہ وہ مہمان کے ساتھ ہی رہے گی۔ دن کو اس کے ساتھ کھیلتی رہے گی اور رات کو اس کے ساتھ لپٹ کر سو جایا کرے گی۔

میں یہ دیکھ اور سن کر حیران ہوا تھا کہ وہ سر ہلا کر یا پھر ہنس کر جواب دینے والی شرم و حیا کی وجہ

سے زبان سے کام نہیں لیا کرتی تھی بلکہ وہ اس لیے نہیں بولتی تھی کیونکہ وہ چھ سال کے بچے کی طرح باتیں کیا کرتی تھی وہ بھی صرف اپنے ابا سے۔ اور ابا اپنی بیٹی جس کی جسمانی عمر ۲۸ سال اور ذہنی عمر فقط چھ سال کی خواہش پوری کرنے کی خاطر مجھے لاکھوں کی جائداد، درجنوں سونے کی اینٹیں اور ۲۵ لاکھ روپے دے کر اپنا داماد بنانے کی گزارش کر چکا تھا۔ اس لیے میں رات کے اندھیرے میں وہاں سے رفو چکر ہو کر کئی دن پہاڑی راستوں پر چلتا رہا۔

مجھے نہ اپنے بچھڑے ساتھی مل سکے اور نہ وہ راستہ مل سکا جو مجھے اپنی منزل تک پہنچا سکتا تھا۔ ہر طرف ایک ہی منظر۔ برف کی چادر اوڑھے زمین، بادلوں میں چھپا آکاش، اردگرد ایک ہی شکل کے درخت۔ پھر ایک انسان کی شکل دیکھ کر میں نے گویا بھگوان کو دیکھا تھا!

بوڑھا مجھے ایک آشرم میں لے گیا تھا جہاں میں نے ایک درمیانی عمر کی سنیاسن کو دیکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وجہ یہ کہ اس کو اپنی ماں چھ سال کی عمر میں رشی کے آشرم میں چھوڑ کر چلی گئی تھی تب سے اب تک وہ آشرم میں ہی رہتی ہے۔ عورت کے بوڑھے ملازم نے مجھے بتا دیا تھا کہ عورت کی ماں سے رشی نے اُس کی پہلی اولاد مانگ کر خوش حال زندگی کا یقین دلایا تھا اور عقیدت نے اُس کی ماں کی زندگی میں اتنے رنگ بھر دیے تھے کہ بدیش میں اُس کا ہر دن ہولی کی طرح رنگ بھرا ہو گیا تھا! حالانکہ رشی نے عورت یا چالیس سال کی کنواری لڑکی کو اپنی بیٹی کی طرح پالا پوسا تھا مگر جب میں نے ایک انقلابی کی طرح عورت کو رشی کی عقیدت کی جزا کی بجائے ایک خود غرض کرشمات کرنے والے کی قیدی مگر پہاڑی گائے کہا تب عورت اُدھ کھلے دروازے کے ساتھ کھڑی ہو کر سب سن رہی تھی۔ پہلی بار کسی فرد سے باتیں کرتے ہوئے میری نظروں میں حیا اور احسان مندی کے عکس دیکھ کر وہ میرے ساتھ بھاگ کر رہائی چاہتی تھی مگر میں عقیدت کے آئینے کو دھندلا کرنے کے بجائے خود ہی دھند میں اپنا راستہ تلاش کرتے ہوئے چلتا رہا اور ایک ایسی جگہ جہاں برف اور درختوں کے بغیر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا وہاں نہ چرند اور نہ پرند تھے۔ اس کے بجائے ایک چھوٹا سا راستہ آتے ہی میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ عورت نما لڑکی نے جس کو رشی کی کٹیا میں بہت جلد منزل مقصود پا لینے کا پُر اعتماد بھروسہ دلایا تھا وہ رنگ لایا تھا کیونکہ راستہ ایک خستہ حال مکان کے دروازے پر ختم ہوا۔ اور میں جب چاروں طرف آٹھ آٹھ فٹ برف سے گھرے اور برف کے بوجھ سے دبے مکان میں داخل ہوا تھا۔ ایک ٹھٹھر رہی لڑکی اپنے سو رہے والدین کو جگانے کی کوشش کر رہی تھی! لڑکی میرے سینے سے اس وقت بھی لپٹی ہوئی ہے مگر گہری

نیند سو رہی ہے اس لیے چولہے میں لکڑی اور شعلوں کی روشنی میں، میں نے لڑکی کے والدین کو جگا کر اپنی مجبوریوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے برف کے دو مجسّموں کو چھو رہا ہوں۔

وہ دونوں میرے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی مر چکے تھے اور لڑکی زندہ تھی۔ وہ بھی سردی سے پہلے نیلے رنگ کی ہوئی ہوتی اور بعد میں اپنے والدین کی ہم رنگ۔ یہ سانحہ میں نے رات کے آخری پہر میں دیکھا تھا۔

رات کٹ گئی ہے لیکن اُفق پر کھڑی سحر کو کالے بادلوں نے دبوچ لیا ہے اور کالی سحر کو دروازے پر کھڑا دیکھ تذبذب کا شکار ہو چکا ہوں۔ دل اور دماغ کے درمیان ہو رہی جذباتی تکرار کروٹ بدل کر منطق کی جنگ کا بگل بجا کر مجھ کو میرے ہی خلاف اُکسا بھی رہی ہے اور ہتھیار چھوڑنے کے لیے دباؤ بھی ڈال رہی ہے۔

کبھی سوچ رہا ہوں کہ میں جو منزل پا لینے کی خاطر جس مشن کی سربراہی کرنے یہاں شہر سے سینکڑوں میل دور آیا ہوں، اس کو پورا کر کے اُس شیطان کا نام و نشان مٹا دوں کہ جنگلات کی غیر قانونی کٹائی سے اقتصادی اور آب و ہوا کا بحران پیدا کر رہا ہے۔ اپنے ذاتی فائدوں کے لیے معاشرے میں رہ کر دوسروں کا حق چھین رہا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے شاطر کوئل اپنے انڈوں کو کوّے کے انڈوں کے ساتھ اس کے گھونسلے کے اندر رکھ کے آتی ہے۔ بچے نکل آتے ہیں تو کوئل کے بچے کوّے کے بچوں کو کمزور بنا کر خود موٹے تازے ہو جاتے ہیں۔ جنگلات کی غیر قانونی کٹائی اور لکڑی کی مجرمانہ تسکری کرنے والوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لینا پوشیدہ سرکاری مشن ہے جس کو پورا کرنے کے لیے مجھے انعام و اکرام سے نوازا جا سکتا ہے اس لیے مجھے اپنا سفر جاری رکھنا ہوگا مگر آفتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی میں سوچ رہا ہوں کہ اس لڑکی کو کس کے بھروسے چھوڑ کر اس گھر کی دہلیز پار کروں؟ اس بیچاری کو یا کوئی جنگلی جانور دبوچ کر کھا جائے گا یا پھر کوئی لکڑی چور اپنے ساتھ لے کر چرائی ہوئی لکڑی کی طرح سستے داموں بیچ ڈالے گا زندہ گوشت کا کاروبار کرنے کی خاطر۔

کیا اس لڑکی کو اپنے ساتھ لینا ہمارے مشن کا ایک اہم جز ہو سکتا ہے؟ نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک بے زبان جنگل کا درخت تو نہیں ہے؟ وہ ایک انسان ہے! سب کے سامنے مجھ سے لپٹ جائے تو بے شمار کہانیوں کو جنم دے گی، یعنی ایک اور آفت! گویا آفتوں کے دور میں چین کی چند گھڑیاں ملنا ناممکن۔ کیوں نہ لڑکی کو آشرم میں چھوڑ آؤں؟ مگر نہیں وہاں رہ کر یہ لڑکی انسان سے دیوی بن جائے گی اور سال میں دوبارہ وہ بھگتوں کی مرادیں پوری کرتی رہے گی۔ ایک کرب سے کراہتے

ہوئے ایک دن پتھر بن کر! دوسری لڑکی؟ نہیں نہیں۔ وہ لڑکی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی بلکہ بچاؤ بھی نہیں کر سکتی۔ کبھی کبھی چودہ سال کا لڑکا بھی مرد بن جاتا ہے۔ ہاں پہلی لڑکی کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے کیونکہ وہ یقیناً حوّا کی بیٹی ہے! جو لڑکی دس سال کی عمر میں مجھے اپنی باتوں اور حرکتوں سے اپنی مرحومہ ماں کی یاد دلاتی رہی کیا وہ دو سال کی لڑکی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی؟ ضرور کر سکتی ہے مگر......

آفتوں کے اس گھنے جنگل میں اسے کیسے ڈھونڈوں گا۔ ہر طرف ہم شکل درخت ہیں اور اِرد گرد صرف برف کی چادر نظر آ رہی ہے۔

OO

ویریندر پٹواری

ای-8، سیکٹر-41، نوئیڈا-201303 (اترپردیش)

کوائف

- نام : پنڈت ویریندر کمار پٹواری
ولد : مرحوم پریم ناتھ پٹواری مسرور کشمیری
قلمی نام : ویریندر پٹواری
پیدائش : 11 ستمبر 1940ء
جائے پیدائش : سری نگر، کشمیر
تعلیم : سول انجینئرنگ گریجویٹ، ممبر انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز انڈیا

- **پہلی کہانی** 'سسکیاں' جو 1965ء میں شائع ہوئی تھی۔ تاحال تقریباً 270 کہانیاں جو ملک کے انٹرنیشنل لیول پر شائع ہونے والے ادبی جرائد مثلاً 'آجکل'، 'شاعر'، 'بیسویں صدی'، 'انشا'، 'امکان'، 'روزن'، 'ایوانِ اردو'، 'دل رس'، 'تمثیل'، 'شیرازہ'، 'مباحثہ' جیسے معیاری جرائد میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

- **کتب:** 8 عدد افسانوں کے مجموعے:
'فرشتے خاموش ہیں' (1981)، 'دوسری کرن' (1986)
'بے چین لمحوں کا تنہا سفر' (1988)، 'آواز سرگوشیوں کی' (1995)،
'ایک ادھوری کہانی' (2002)، 'اُفق' (2003)، 'دائرے' (2010)،
'آفتوں کے دور میں' (2011)۔
دو عدد ڈراموں کے مجموعے:
'آخری دن' (1983)، 'انسان' (2006)
ہندی میں ناولٹ: 'کب بھور ہوگی' (2000)
کشمیری افسانوں کا مجموعہ 'علم' (2007)

ڈرامے
پہلا ریڈیو ڈرامہ 'گھر' 1981ء
پہلا ٹی وی ڈرامہ 'ماں' 1981ء
تاحال 16 عدد ریڈیو ڈرامے، 7 عدد ٹی وی پلیز،
6 عدد ٹیلی فلمز، 18 عدد ٹیلی سیریلز، تقریباً 100 قسطیں

- **تحقیقی مطالعے میں آچکے دو عدد مجموعے** (بابت ایم فل جموں یونیورسٹی)
(1) بے چین لمحوں کا تنہا سفر (افسانوں کا مجموعہ)
(2) انسان (ڈراموں کا مجموعہ)

- **انعامات:** اردو اکادمی بہار: دوسری کرن،
آواز سرگوشیوں کی، اُفق
دہلی اردو اکادمی: 'انسان'